ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا

حیات اور کارنامے

کبیر احمد جائسی

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان
وزارتِ ترقیِ انسانی وسائل، حکومتِ ہند
ویسٹ بلاک۔1، آر۔کے۔پورم، نئی دہلی۔110066

ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا

حیات اور کارنامے

کبیر احمد جائسی

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان
وزارتِ ترقیِ انسانی وسائل، حکومتِ ہند
ویسٹ بلاک۔1، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔110066

Dr. Zabiullah Safa
Hayat Aur Karname

By : Kabir Ahmad Jaisi

سنہ اشاعت :

پہلا اڈیشن : 1983

دوسرا اڈیشن : 2001 تعداد 500

قیمت : =/69

سلسلہ مطبوعات : 307

ناشر : ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-I، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔ 110066

طابع : لاہوتی پرنٹ ایڈس، جامع مسجد، دہلی۔ 110006

پیش لفظ

"ابتدا میں لفظ تھا۔ اور لفظ ہی خدا ہے"

پہلے جمادات تھے۔ ان میں نمو پیدا ہوئی تو نباتات آئے۔ نباتات میں جبلت پیدا ہوئی تو حیوانات پیدا ہوئے۔ ان میں شعور پیدا ہوا تو بنی نوع انسان کا وجود ہوا۔ اسی لیے فرمایا گیا ہے کہ کائنات میں جو سب سے اچھا ہے اس سے انسان کی تخلیق ہوئی۔

انسان اور حیوان میں صرف نطق اور شعور کا فرق ہے۔ یہ شعور ایک جگہ پر ٹھہر نہیں سکتا۔ اگر ٹھہر جائے تو پھر ذہنی ترقی، روحانی ترقی اور انسان کی ترقی رک جائے۔ تحریر کی ایجاد سے پہلے انسان کو ہر بات یاد رکھنا پڑتی تھی، علم سینہ بہ سینہ اگلی نسلوں کو پہنچتا تھا، بہت سا حصہ ضائع ہو جاتا تھا۔ تحریر سے لفظ اور علم کی عمر میں اضافہ ہوا۔ زیادہ لوگ اس میں شریک ہوئے اور انھوں نے نہ صرف علم حاصل کیا بلکہ اس کے ذخیرے میں اضافہ بھی کیا۔

لفظ حقیقت اور صداقت کے اظہار کے لیے تھا، اس لیے مقدس تھا۔ لکھے ہوئے لفظ کی، اور اس کی وجہ سے قلم اور کاغذ کی تقدیس ہوئی۔ بولا ہوا لفظ، آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ ہوا تو علم و دانش کے خزانے محفوظ ہو گئے۔ جو کچھ نہ لکھا جا سکا، وہ بالآخر ضائع ہو گیا۔

پہلے کتابیں ہاتھ سے نقل کی جاتی تھیں اور علم سے صرف کچھ لوگوں کے ذہن ہی سیراب ہوتے تھے۔ علم حاصل کرنے کے لیے دور دور کا سفر کرنا پڑتا تھا، جہاں کتب خانے ہوں اور ان کا درس دینے والے عالم ہوں۔ چھاپہ خانے کی ایجاد کے بعد علم کے پھیلاؤ میں وسعت آئی کیونکہ وہ کتابیں جو نادر تھیں اور وہ کتابیں جو مفید تھیں آسانی سے فراہم ہوئیں۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا بنیادی مقصد اچھی کتابیں، کم سے کم قیمت پر مہیا کرنا ہے تاکہ اردو کا دائرہ نہ صرف وسیع ہو بلکہ سارے ملک میں سمجھی جانے والی، بولی جانے والی اور پڑھی جانے والی اس زبان کی ضرورتیں پوری کی جائیں اور نصابی اور غیر نصابی کتابیں آسانی سے مناسب قیمت پر سب تک پہنچیں۔ زبان صرف ادب نہیں، سماجی اور طبعی علوم کی کتابوں کی اہمیت ادبی کتابوں سے کم نہیں، کیونکہ ادب زندگی کا آئینہ ہے، زندگی سماج سے جڑی ہوئی ہے اور سماجی ارتقاء اور ذہنِ انسانی کی نشو و نما طبعی، انسانی علوم اور ٹکنالوجی کے بغیر ممکن نہیں۔

اب تک بیورو نے اور اب تشکیل کے بعد قومی اردو کونسل نے مختلف علوم اور فنون کی کتابیں شائع کی ہیں اور ایک مرتب پروگرام کے تحت بنیادی اہمیت کی کتابیں چھاپنے کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ یہ کتاب اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ امید ہے یہ اہم علمی ضرورت کو پورا کرے گی۔ میں ماہرین سے یہ گذارش بھی کروں گا کہ اگر کوئی بات ان کو نادرست نظر آئے تو ہمیں لکھیں تاکہ اگلے ایڈیشن میں نظر ثانی کے وقت خامی دور کر دی جائے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ
ڈائرکٹر
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند، نئی دہلی

فہرست

نقشِ حیات

ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا عصرِ حاضر کے ان چوٹی کے ایرانی عالموں کی صف میں ایک ممتاز مقام و مرتبہ کے حامل ہیں جن کے دم سے علمیت، دقیقہ سنجی اور نکتہ رسی کا بھرم قایم ہے ایران کا یہ چھیاسٹھ سالہ "جواں مرد" جس کے قلم سے اب تک تقریباً چالیس کتابیں شائع ہو چکی ہیں آج بھی تصنیف و تالیف کے کام میں مشغول ہے اور اپنی علمی نکتہ سنجی سے ایرانی تاریخ، ادبیات اور تمدن کے بہت سے چھپے ہوئے گوشوں کو بے نقاب کر رہا ہے۔ خوش قسمتی سے ڈاکٹر صفا کی ایک قدرے مختصر کتاب کا خانم عندلیب زہرا نے اُردو میں ترجمہ کر دیا ہے جس کی وجہ سے بہت سے اُردو خواں حضرات بھی ڈاکٹر صفا کے نام اور کام سے واقف ہو گئے ہیں لیکن ابھی تک اُردو دنیا سے ان کا بھرپور تعارف نہیں کرایا جا سکا ہے اسی لیے عام طور سے اُردو خواں حضرات ان کے مقام و مرتبہ سے پوری طرح واقف نہیں ہیں سطور ذیل میں کوشش کی جا رہی ہے کہ ڈاکٹر صفا کی حیات اور کارناموں پر کسی قدر تفصیل سے نظر ڈالی جائے۔

ڈاکٹر صفا، مئی ۱۹۱۱ء کو سمنان کے ایک قصبہ شہمیرزاد میں پیدا ہوئے ان کے والد اپنے زمانے کے ایک بہت ہی کامیاب تاجر تھے اسی لیے ان کی ابتدائی زندگی بڑے ناز و نعم اور خوش حالی میں بسر ہوئی اور غالباً یہ ان کے والد ہی کا فیضان ہے کہ وہ آج بھی ایک نہایت کامیاب اور خوش حال زندگی بسر کر رہے ہیں انھوں نے اپنی ابتدائی تعلیم کا آغاز بابل سے کیا، ابتدائی تعلیم

ختم کرنے کے بعد وہ تہران چلے آئے۔ تہران میں انھوں نے اپنی متوسط تعلیم کی ابتدا کی اور ۱۹۲۳ء میں مدرسۂ دار الفنون سے فارغ التحصیل ہوئے۔ متوسط تعلیم کو کامیابی سے ختم کرنے کے بعد وہ تہران یونیورسٹی میں داخل ہوئے اور یہیں سے انھوں نے ۱۹۳۶ء میں اعلیٰ تعلیم کی ڈگری لی۔ اس کے بعد سات سال تک وہ اپنے تحقیقی کام میں لگے رہے اور ۱۹۴۳ء میں تہران یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کی ڈگری لینے میں کامیاب ہوئے۔

ڈاکٹر صفا کی یہ بہت بڑی خوش قسمتی تھی کہ تہران یونیورسٹی میں ان کو بدیع الزمان فروز انفر جیسا یگانۂ روزگار استاد ملا۔ مرحوم فروز انفر کا شمار ماضی قریب کے ان ایرانی عالموں میں ہوتا ہے جنھوں نے فارسی ادبیات کو یوروپی ادبیات کے پہلو بہ پہلو لاکر کھڑا کردیا تھا۔ بدیع الزمان فروز انفر کے انتقال کو برسوں ہوچکے مگر ڈاکٹر صفا کے ذہن اور دماغ میں وہ آج بھی زندہ ہیں۔ وہ اب بھی جب کچھ لکھتے ہیں تو محسوس کرتے ہیں کہ فروز انفر مرحوم بیٹھے ہوئے ان کو تادیبی نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں کہ" دیکھو کسی غلطی کے مرتکب نہ ہو جانا"۔ اس احساس کی وجہ سے ڈاکٹر صفا جس موضوع پر بھی قلم اٹھاتے ہیں پوری تیاری کے بعد اٹھاتے ہیں اور جہاں تک ممکن ہو سکتا ہے اس موضوع کا حق ادا کردیتے ہیں۔

اعلیٰ تعلیم کی ڈگری پاتے ہی ڈاکٹر صفا کو شرف سکنڈری اسکول تہران میں فارسی زبان وادبیات کے استاد کی حیثیت سے جگہ مل گئی جہاں وہ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۱ء تک معلمی کا فریضہ انجام دیتے رہے ۱۹۴۲ء میں ان کا تقرر تہران یونیورسٹی میں تاریخ ادبیات کے اسسٹنٹ پروفیسر کے عہدہ پر ہوا ۱۹۵۲ء تک وہ اسی عہدہ پر کام کرتے رہے۔ اسی سال مذکورہ شعبہ میں ان کا تقرر پروفیسر اور صدر شعبہ کی حیثیت سے ہوگیا اور کامل سترہ برس تک وہ اس فریضہ کو انجام دیتے رہے۔ اپنی اسی ملازمت کے دوران ڈاکٹر صفا کو دوبار اپنے ملک سے باہر جاکر ہمبرگ یونیورسٹی میں "تاریخ تمدن وادبیاتِ فارسی" کے پروفیسر کی حیثیت سے بھی کام کرنے کا موقع ملا پہلی مرتبہ انھوں نے

۱۹۶۲ء، ۱۹۶۳ء میں یہ فریضہ انجام دیا پھر دوبارہ ۱۹۶۹ء، ۱۹۷۰ء[1] میں اسی منصب پر فائز ہوئے ۱۹۷۲ء سے ڈاکٹر صفا "شورای عالی فرہنگ و ہنر" کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں اور آج بھی اسی منصب پر فائز ہیں۔

ان تعلیمی مناصب کے علاوہ وہ مدتوں سے سیکڑوں کمیٹیوں کے ممبر سکریٹری یا چیرمین کی حیثیت سے بھی کام کر رہے ہیں اور اب بھی بہت سی ملکی اور غیر ملکی کمیٹیوں سے منسلک ہیں اس لحاظ سے اگر ان کو ایران کا مصروف ترین ادیب کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا مگر ان مصروفیتوں کے باوجود بھی وہ کسی نہ کسی طرح لکھنے پڑھنے کا وقت نکال ہی لیتے ہیں اور آج بھی تصنیف و تالیف کے کاموں میں اسی سرگرمی اور جاں فشانی سے مصروف ہیں جس طرح اب سے تیس سال پہلے سرگرم تھے۔

ڈاکٹر صفا نے ایک ملاقات میں راقم سطور سے بتلایا تھا کہ انھوں نے اپنی تصنیفی زندگی کا آغاز ایک شاعر اور افسانہ و ناول نگار کی حیثیت سے کیا تھا، ان کے اشعار کا ایک مجموعہ "نشۂ جام" کے نام سے شائع بھی ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے جو ناول اور افسانے لکھے تھے وہ ملک کے مختلف جرائد میں اسی زمانے میں شائع بھی ہو گئے تھے لیکن کوئی ناول یا افسانوں کا مجموعہ ابھی تک کتابی شکل میں شائع نہیں ہوا ہے ناولوں اور افسانوں کے مسودے مرتب ہو چکے ہیں اور امید ہے کہ جلد ہی چھپ کر منظرِ عام پر آجائیں گے۔ اسی زمانے میں جب کہ ڈاکٹر صفا شعر کہہ رہے تھے اور ناول و افسانہ نگاری کی طرف مائل تھے، ان کی توجہ تحقیق کی طرف مبذول ہو گئی ان کا پہلا تحقیقی مقالہ مجلہ "مہر" میں اس وقت شائع ہوا جب وہ نوجوان تھے۔ اس مقالہ کی اشاعت کے بعد ان کی ہمت ایسی بڑھی کہ وہ تحقیق اور صرف تحقیق کے ہو کر رہ گئے۔ اگرچہ انھوں نے اور بھی بہت سارے کام کیے ہیں مگر تحقیق ادبیات ان کا مخصوص میدانِ کار بن گیا ہے۔

[1] یہ ملاقات شورای عالی فرہنگ و ہنر تہران کے دفتر میں ۵ رفروری ۱۹۷۷ء کو ہوئی تھی

جب مجھے ڈاکٹر صفا کی شعر گوئی اور ناول و افسانہ نویسی کا علم ہوا تو میں یہ پوچھے بغیر نہ رہ سکا کہ " آخر آپ ادبی تحقیق کی طرف کس طرح راغب ہوئے؟" اس سوال کا جواب ڈاکٹر صفا نے خاصی تفصیل سے دیا جس کو اختصار کے ساتھ یہاں درج کیا جا رہا ہے تاکہ ان کے افکار و خیالات کو سمجھنے میں آسانی ہو۔

شروع شروع میں تاریخ ادبیات ڈاکٹر صفا کی تحقیق کا خاص موضوع نہیں تھا بلکہ وہ اپنے فرائض منصبی کے تحت اس کا درس دیتے تھے۔ درس کے دوران ان کو شدت کے ساتھ یہ کمی محسوس ہوئی کہ فارسی زبان میں فارسی ادبیات کی کوئی تاریخ ابھی تک نہیں لکھی گئی ہے۔ اس علمی کمی کو کسی نہ کسی طرح پورا کرنا چاہیئے چنانچہ اسی احساس کے تحت وہ ایران کی ادبی تاریخ کو مرتب کرنے میں لگ گئے۔ ایرانی ادب کی تاریخ پر ڈاکٹر صفا نے جو کتاب لکھی ہے اس کا نام "تاریخ ادبیات در ایران" ہے۔ جس کی تین ضخیم جلدیں اب تک شائع ہو کر منظرِ عام پر آ چکی ہیں لیکن ابھی تک یہ کام مکمل نہیں ہوا ہے اور ڈاکٹر صفا اس کو مکمل کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی انھوں نے تاریخ ادبیاتِ ایران سے متعلق اور بھی کام کیے ہیں لیکن اس کے باوجود ان کا اپنا خیال ہے کہ ان کا اصل میدانِ کار "فرہنگِ ایران" ہے "تاریخِ ادبیات" نہیں۔

ڈاکٹر صفا نے جب ایران کی ادبی تاریخ پر کام شروع کیا تھا اس وقت تک فارسی زبان میں اس موضوع پر کوئی کتاب نہیں لکھی گئی تھی وہ پہلے ایرانی محقق و ادیب تھے جنھوں نے اس کام کا بیڑا اٹھایا اور اب تک اسی کام کو سمیٹنے میں لگے ہوئے ہیں۔ تاریخِ ادبیات کے ساتھ ساتھ وہ تاریخِ علوم اور تاریخ ایران پر بھی کام کرتے رہے اس سلسلہ میں انھوں نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے اس کا بیشتر حصہ کتابی صورت میں شائع ہو چکا ہے۔ خود ان کا خیال ہے کہ انھوں نے معلمانہ ضرورتوں کے تحت اُن کاموں کو انجام دینے کی کوشش کی جن پر اس زمانے تک کوئی کام نہیں ہوا تھا اور ان سے جہاں تک

ممکن ہو سکا انھوں نے ان کاموں کو بہتر سے بہتر طور پر انجام دینے کی کوشش کی۔ اسی سلسلۂ سخن میں ڈاکٹر صفا نے ایک بہت چونکا دینے والی بات بھی کہی۔ کہنے لگے "میں نے ہمیشہ "تاریخ ادبیات ایران" کو "تاریخِ فرہنگِ ایران" کی نظر سے دیکھا کیونکہ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ کسی ملک کی ادبی تاریخ اس وقت تک مرتب نہیں کی جا سکتی جب تک اس کا مطالعہ اس کے تمدن کی تاریخ کی روشنی میں نہ کیا جائے۔"

بالعموم تحقیق اور تنقید کو دو بالکل الگ الگ فن سمجھا جاتا ہے اور خیال کیا جاتا ہے کہ کوئی مجرد محقق کبھی ناقد نہیں ہو سکتا اور نہ ہی کوئی مجرد ناقد کبھی تحقیق کا حق ادا کر سکتا ہے لیکن ڈاکٹر صفا کا خیال ہے کہ تنقید اور تحقیق ایک ہی فن کے دو رُخ ہیں اور ایک رخ دوسرے رخ سے بے نیاز ہو کر اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکتا ان کا یہ بھی خیال ہے کہ تنقید اور تحقیق دونوں کو ایک دوسرے کا معاون و مددگار ہونا چاہیئے، جب تک تنقید میں تحقیق کا عنصر یا تحقیق میں تنقید کا عنصر شامل نہ ہوگا دونوں ہی بے رنگ و روح ہوں گے۔ محقق کو صرف ادبیات ہی کا ناقد نہیں ہونا چاہیئے بلکہ اس کو ہمیشہ اپنا بھی احتساب کرتے رہنا چاہیئے چنانچہ وہ ہمیشہ اپنے احتساب میں مشغول رہتے ہیں اور اپنے نوشتوں پر برابر حک و اصلاح کیا کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صفا کے نزدیک انتقاد کی سب سے بڑی خصوصیت "بے تعصبی" ہے اگر کوئی ناقد اپنی تنقیدوں میں انصاف سے کام نہیں لے سکتا تو وہ فریضہ انتقاد سے عہدہ برآ بھی نہیں ہو سکتا۔

ڈاکٹر صفا محقق و ناقد ہونے کے ساتھ ساتھ چونکہ شاعر بھی ہیں اس لیے ضروری معلوم ہوا کہ عصرِ حاضر کی فارسی شاعری کے بارے میں بھی ان کے خیالات سے استفادہ کر لیا جائے تا کہ ان کے علمی و ادبی افکار کو سمجھنے میں مزید آسانی ہو۔ ڈاکٹر صفا کے نزدیک عصرِ حاضر کے فارسی شعراء تین خانوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ (۱) سُنتی (مقلدین) (۲) میانہ رو (۳) جدید۔ سُنتی شعراء سے ان کو یہ شکایت ہے کہ ان کے یہاں نہ کوئی تازگی ملتی ہے اور نہ ہی افکار کی گیرائی و گہرائی

وہ صرف قدما کے گھسے پٹے مضامین کو عروض کے قالب میں ڈھالے جا رہے ہیں جس کی وجہ سے ان کی شاعری روح انسانی کے تاروں کو چھیڑنے میں ناکام رہتی ہے ڈاکٹر صفا کے نزدیک عصرِ حاضر کے نمائندہ شعرا وہ لوگ ہیں جن کو وہ میانہ رو شعرا کے نام سے یاد کرتے ہیں ان شعرا میں انھوں نے خاص طور سے ملک الشعرا بہار، لطف علی صورتگر، رہی معیری، پژمان بختیاری کا نام لیا۔ یہ وہ شعرا ہیں جنھوں نے نہ تو قدما کی روش کو بالکل ترک کیا اور نہ ہی لکیر کے فقیر ہو کر رہے بلکہ انھوں نے فارسی کی کلاسیکی شاعری کی اعلیٰ روایات کو برقرار رکھتے ہوئے اپنے زمانے کے مسائل انسان کی ناآسودگی اور معاشرہ کے انتشار کو ایسے شاعرانہ انداز سے پیش کیا ہے کہ ان کی شاعری روایتی اور جدید شعرا کی شاعری سے بالکل الگ اپنی مخصوص خصوصیات کی حامل بن گئی ہے۔ یہی شاعری عصرِ حاضر کی نمائندہ اور زندہ رہنے والی شاعری ہے اور اسی کے دم سے فارسی شاعری کی پیش رفت برقرار ہے۔ جہاں تک جدید شعرا اور ان کی شاعری کا تعلق ہے اس سلسلہ میں ڈاکٹر صفا کا ذہن بہت صاف ہے۔ ڈاکٹر صفا کے نزدیک ایسے شعرا "دانشمند" اور "اہلِ ادب" کہلانے کے مستحق نہیں ہیں البتہ یہ ضرور ہے کہ یہ شعرا ان حلقوں میں پسند بھی کیے جاتے ہیں جو ادبیات سے ناواقف ہیں۔ ڈاکٹر صفا کے ان خیالات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آج کے "جدید فارسی شعرا" جو کچھ لکھ رہے ہیں اس کے بارے میں وہاں کے بزرگ ادیبوں اور ناقدوں کا کیا خیال ہے؛ یہ فیصلہ تو آنے والا وقت ہی کرے گا کہ کس طبقہ کی رائے کس حد تک درست ہے مگر خیالات کے اس اختلاف کی وجہ سے عصرِ حاضر کے ایران کی ادبی فضا میں ایک خاص قسم کی کشیدگی اور تناؤ پیدا ہو گیا ہے جو بہر حال ادبی پیش رفت کی دلیل بھی کہا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر صفا کے افکار کا تفصیلی جائزہ لینے سے پہلے بہتر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اب تک ان کے قلم سے جو کتابیں نکل چکی ہیں ان کی فہرست بھی یہاں درج کر دی جائے۔

۱۔ حماسہ سرائی در ایران

۲- تاریخ مختصر تحولِ نظم و نثر فارسی
۳- تاریخ علوم عقلی در تمدنِ اسلامی
۴- تاریخ ادبیات در ایران (اس کتاب کی تین ضخیم جلدیں شائع ہو چکی ہیں بقیہ جلدیں بعد میں شائع ہوں گی)
۵- دانش ہای یونانی در شاہنشاہی ساسانی
۶- گنجِ سخن (تین جلدیں، یہ فارسی شعرار کا ایک انتخاب ہے جس میں ہر شاعر کے حالات اور ایک مبسوط مقدمہ مرتب کے قلم کا شامل ہے۔ ڈاکٹر صفا نے اس مقدمے میں ایران کی تاریخ شعر پر بڑی دیدہ ریزی سے نگاہ ڈالی ہے)
۷- جشن نامۂ ابن سینا (تین جلدیں)
۸- یادنامۂ خواجہ نصیر طوسی
۹- رافائل (لامارٹین کی کتاب Raphael کا فارسی ترجمہ)
۱۰- مرگ سقراط (لامارٹین کی کتاب " Lamort de Socrate کا فارسی ترجمہ)
۱۱- اسرار التوحید فی مقامات الشیخ ابی سعید (تصحیح انتقادی)
۱۲- مزدا پرستی در ایرانِ قدیم
۱۳- کیانیان (کریسٹن سن کی کتاب Kavanides. کا فارسی ترجمہ)
۱۴- آئینِ سخن در معانی و بیان فارسی
۱۵- دیوان عبدالواسع جبلی (۲ جلدیں، مقدمہ، حواشی اور تعلیقات کے ساتھ)
۱۶- دیوان سیف الدین محمد فرغانی (۳ جلدیں، مقدمہ، حواشی اور تعلیقات کے ساتھ)
۱۷- داراب نامہ محمد بیغمی (۲ جلدیں، " " ")
۱۸- ورقہ و گلشاہِ عیوقی (مقدمہ و حواشی کے ساتھ)
۱۹- داراب نامہ طرسوسی ۲ جلدیں
۲۰- احوال و آرار لایب نیز (Leibniz)
۲۱- بختیار نامۂ دقایقی مروزی (۲ جلدیں، مقدمہ، حواشی اور توضیحات کے ساتھ)
۲۲- شاہنشاہ در تاریخ و ادب فارسی

۲۳۔ آئین شاہنشاہیِ ایران
۲۴۔ تطور الشعر الفارسی و اتواعہ (عربی مطبوعہ بیروت)
۲۵۔ تحریراتِ خواجہ نصیر الدین طوسی
۲۶۔ مشرق زمین در برابر مشکلاتِ زندگیِ جدید۔
۲۷۔ فرق شیعہ در ایران از اواسطِ قرن پنجم تا اوائل قرن ہفتم ہجری
۲۸۔ رسالۂ اقسامِ نفوس ابن سینا (تصحیح انتقادی مع تعلیقات)
۲۹۔ ملاحظاتی در باب قدیم ترین عہد آئین اوستائی
۳۰۔ Cultured unity in diversity (Calcutta 1961)
۳۱۔ گنجینۂ سخن (۵ جلدیں فارسی نثر کا انتخاب)
۳۲۔ احوال و آثار ابوریحان بیرونی
۳۳۔ Biruni, Ses oeuvres et Ses Pen Ses
۳۴۔ Djalal al - Din Mawlavi, grand Pen Seur et Poet Person
۳۵۔ نیکی نامہ
۳۶۔ دور نمائی از فرہنگ ایرانی و تاثیر جہانی آن
۳۷۔ مقدمہ ای بر تصوف،
۳۸۔ حکیم فاراب،

ان کتابوں کی تصنیف و تدوین کے علاوہ ڈاکٹر صفا نے متعدد رسالے بھی تحریر کیے ہیں اور سیکڑوں کی تعداد میں مقالے بھی لکھے ہیں جو ایران اور بیرونی ممالک کے رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ ایسے کثیر التصانیف مصنف کے تمام کارناموں کا جائزہ لینا ہمارے لیے دشوار ہے اس لیے ہم ان کی صرف چند کتابوں کے مندرجات پر بحث کرتے ہوئے ان کے افکار و خیالات تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

"حماسہ سرائی در ایران" پر ایک نظر

ڈاکٹر صفا کی تصانیف پر نظر ڈالتے وقت ان کی جس کتاب پر سب سے پہلے نظر پڑتی ہے وہ ان کی مشہور و معروف تصنیف " حماسہ سرایی در ایران " ہے جس کو بلاشبہ ان کی اہم ترین تصنیف کہا جا سکتا ہے۔ پونے سات سو صفحات کی یہ ضخیم تصنیف مصنف کے وسعت مطالعہ، دیدہ ریزی، اَن تھک محنت اور اخذِ نتائج کے سلیقے کو آشکار کرنے کے لیے کافی ہے۔ اب تک اس کتاب کے تین ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور آج بھی علمی و ادبی دنیا میں اس کتاب کا مطالعہ بڑے ذوق و شوق سے کیا جاتا ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ اس کتاب کی تازگی و توانائی اب بھی اپنی جگہ پر برقرار ہے۔

ڈاکٹر صفا نے جس وقت حماسہ سرائی کے موضوع پر کام کرنا شروع کیا تھا اس وقت تک فارسی زبان میں اس موضوع پر کوئی خاص کام نہیں ہوا تھا، خود ان کے قول کے مطابق صرف حسن تقی زادہ کا وہ مقالہ جو انھوں نے " بیانِ احوال و آثارِ فردوسی" کے عنوان سے لکھا تھا وہ حماسۂ ملّی ایران کے موضوع سے ضرور بحث کرتا ہے اور اپنی جگہ پر تحقیق کا نادر نمونہ بھی ہے مگر چونکہ اس مقالہ کا موضوع فردوسی ہے حماسہ سرایی نہیں اس لیے اس مقالہ میں صرف اُن آثار سے بحث کی گئی ہے جن کی مدد سے فردوسی نے اپنی رزمیہ مثنوی " شاہنامہ" لکھی ہے، اور اس سلسلہ کے دیگر مباحث

کو قصداً چھوڑ دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر صفا کو اس کتاب کو لکھتے وقت کس دقت کا سامنا کرنا پڑا اس کا ذکر بھی بے جا نہ ہوگا چنانچہ یہ سرگذشت ان ہی کی زبان میں سنیے۔

اشکالِ بزرگ کار من در آنست کہ روایات و منظومہ ہای حماسی ہموارہ از قدیم ترین ایام تمدن ہر قوم آغاز می شود و ازیں روی قدیم ترین عناصرِ تاریخی و ماقبل التاریخ حیات ہر ملت در آں وجود دارد و بر محقق است کہ برائے یافتن ایں عناصر تحقیقاتِ خود را از آں ایام کہن آغاز کند و تحول و تکامل و تغیر و تبدل روایات و ورود عناصرِ جدید را در آں دنبال نماید و اندیشہ را از خلال قرون و اعصارِ مبہم و تاریک و حوادث پیچ در پیچ و وقایع نامعلوم بگذارند و آں گاہ ازیں سفر دراز ارمغان ہا با خویش ہمراہ آورد تا بکار فہم حقیقت ہر منظومۂ ملی آید و وسیلۂ آشنائی واقعی خواہندہ با اصل و اساسِ روایات و داستانہائے آں گردد د داستان ہا و روایاتی کہ بظاہر از مقولۂ خرافات و اوہام است اما در حقیقت مطالبی تاریخی و واقعی است کہ با گذشت روزگار و توالی

میرے کام کی مشکلات اس بات میں مضمر ہیں کہ ہر قوم کی رزمیہ نظموں اور روایتوں کی ابتدا اس کے تمدن کے قدیم ترین زمانہ سے ہوتی ہے اور اسی وجہ سے ان میں ماقبل تاریخ اور قدیم ترین تاریخی عناصر شامل ہو جاتے ہیں۔ یہ محقق کا فرض ہے کہ ان عناصر تک پہنچنے کے لیے اپنی تحقیق کی ابتدا اسی قدیم ترین زمانے سے کرے اور ان کے ارتقا، روایات کے تغیر و تبدل اور جدید عناصر کے اضافوں کا پتہ لگائے اور اپنی فکر کو صدیوں کی گذرگاہوں، تاریک و غیر واضح زمانوں پیچ در پیچ حادثوں اور نامعلوم واقعات کے درمیان سے گزارے۔ پھر اس طول و طویل سفر سے اپنے ساتھ تحفے لائے تا کہ وہ تحفے ہر ملی نظم کی حقیقت کو سمجھنے میں کام آئیں اور ان روایتوں اور داستانوں کی اصل و اساس سے واقعی آشنائی کا سبب بھی بنیں وہ داستانیں اور روایات جو بظاہر کہ اس اور اوہام پرستی معلوم ہوتی ہیں در حقیقت تاریخی اور حقیقی باتیں ہوتی ہیں جو زمانے کے بدلنے کے ساتھ ساتھ

ایام و تواتر اعوام بدیں صورت
در آمدہ)

اطلاع برایں عناصر مختلفِ تاریخی و داستانی و جدا کردن آنہا ازیکدیگر و بحث در منشاء ہر داستان و مبداء ہر روایت و پیدا کردن زمانِ ایجادِ داستانہا و بدست داشتن موازینی برائے نقد اشعار حماسی و تمیز نیک از بد آنہا خود محتاجِ اطلاعات جداگانہ ییست کہ نویسندہ را باید قبلاً از آنہا مطلع باشد و بہنگام کار و مطالعہ از آنہا آگہی یابد۔ فی المثل بحث در منظومہ ہائے حماسی ایران علاوہ براطلاع از زبان و ادبیات فارسی نیازمند اطلاعاتِ دقیق از ادبیات پیش از اسلام خاصہ ادبیات اوستائی و پہلوی است و چوں عالی ترین تحقیقات را دریں باب باید در آثارِ محققان اروپائی جست پس اطلاع از یک یا چند زبانِ اروپائی و ادب آنہا نیز برائے مرد محقق لازمست۔

گذشتہ ازیں دریافتن ارزشِ منظومہ ہائے حماسیِ

مرورِ ایام کے ہاتھوں اس شکل میں
جلوہ گر ہوتی ہیں)

اِن مختلف تاریخی اور افسانوی عناصر سے واقفیت اور ان کو ایک دوسرے سے جدا کرنا، ہر داستان کے مقصد اور ہر روایت کے مبدا سے بحث کرنا، اِن داستانوں کے زمانہ تصنیف کو معلوم کرنا، رزمیہ اشعار پر تنقیدی نظر ڈالنے کا ایک پیمانہ اپنے ہاتھوں میں رکھنا، اور ان کی خوبیوں کو ان کی خامیوں سے الگ کر کے دیکھنا بجائے خود ایک جداگانہ علم کا محتاج ہے اور اس موضوع پر لکھنے والے کو اس علم سے پہلے ہی سے نہ صرف واقف ہونا چاہئے بلکہ اپنے کام کے دوران ان داستانوں کا مطالعہ کرتے ہوئے ان سے مزید آگاہی حاصل کرنی چاہئے مثلاً ایران کی رزمیہ منظومات پر بحث کرنے کیلئے فارسی زبان و ادبیات سے واقف ہونے کے علاوہ پیش از اسلام ادبیات اور بالخصوص اوستائی اور پہلوی ادبیات کا غائر علم رکھنا ضروری ہے اور چونکہ اس سلسلہ میں عالی ترین تحقیقات کو یورپی محققوں کی تخلیقات میں ڈھونڈنا چاہئے اس لیے ایک یا کئی یورپی زبانوں اور ان کے ادبیات سے بھی ایک محقق کا واقف ہونا لازمی ہے

اس کے علاوہ دنیا کی دوسری قوموں کی رزمیہ منظومات کی قدر و قیمت

ملل دیگرِ جہانست، اگرچہ موجز و
مختصر باشد از مقایسۂ شاہنامہ
با بہترین آثار حماسی مللِ جہان
مانند رامایناو مہابھارت متعلق
بہ ہندوان و ایلیاد و ادیسہ
یونانیان و امثالِ اینہا ارزش
و اہمیت ایں شاہکارِ جاوید زبانِ
فارسی دریافتہ می شود بنا بر ایں
مطالعۂ بعضی از ایں آثار نیز
برکسے کہ قدم دریں راہ می نہد
واجب و ضرور است[1]

کا سمجھنا بھی ضروری ہے خواہ اس کے
بارے میں اس کا علم کتنا ہی مختصر اور
سرسری کیوں نہ ہو۔ شاہنامہ کا دنیا کی دیگر
عظیم رزمیہ منظومات مثلاً ہندوستانیوں
کی راماین اور مہابھارت اور یونانیوں
کی ایلیڈ اور اڈیسہ اور اسی قبیل کی
دوسری رزمیہ نظموں سے موازنہ و
مقابلہ کرکے فارسی زبان کے
اس زندۂ جاوید شاہکار کی قدر
وقیمت کا پتہ لگایا سکتا
ہے۔"

اس طول وطویل اقتباس میں ڈاکٹر صفا نے رزمیہ پر کام کرنے والوں کے لیے جن علوم کا جاننا اور جن صفات کا حامل ہونا لازمی قرار دیا ہے اگر اس پر غائر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ خود ڈاکٹر صفا سے زیادہ اس کام کے کرنے کا کوئی اور اہل نہیں ہوسکتا کیونکہ وہ نہ صرف زبان و ادبیاتِ فارسی کے ایک مستند اور ماہر استاد ہیں بلکہ ایران کی قدیم تاریخ اور اس کے قدیم ترین تمدن پر بھی بڑی گہری اور عالمانہ نظر رکھتے ہیں صرف یہی نہیں بلکہ وہ تاریخِ ادبیات کا مطالعہ کرتے وقت تاریخ تمدن کی مدد سے ادبیات کی گم شدہ کڑیاں مرتب کرنے کی سعی میں مصروف رہتے ہیں۔ اسی وجہ سے وہ قدیم رزمیہ نظموں کی خوبیوں کو ان کی خامیوں سے جدا کرکے دیکھنے کے نہ صرف اہل ہیں بلکہ اس وقت ایران کے اہل ترین محقق ہیں۔ ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ وہ ایک یورپی یعنی فرانسیسی زبان سے بھی عالمانہ واقفیت رکھتے ہیں اور اس کی جدید ترین تحقیقات پر بھی ان کی گہری نظر ہے۔ غالباً یہی وجہ

---

[1] حماسہ سرائی در ایران، چاپ سوم، سرآغاز ص ک، ۱۳۵۲ھ ش

ہے کہ "حماسی سرائی در ایران" کے موضوع پر جو کچھ ان کے قلم سے نکل گیا ہے وہ حرفِ اول ہوتے ہوئے بھی ابھی تک حرفِ آخر کی اہمیت کا حامل ہے۔

حماسہ سرائی کے پہلے باب میں ڈاکٹر صفا نے حماسہ کی ماہیت اور کیفیت سے بحث کرکے کسی نتیجہ پر پہنچنے کی کوشش کی ہے۔ سب سے پہلے تو انھوں نے قدما کی پیروی کرتے ہوئے شاعری کو تین الگ الگ انواع میں تقسیم کیا ہے یعنی (۱) تمثیلی شاعری (۲) غنائی شاعری (۳) حماسی شاعری، اور ان تینوں انواع کی شاعری پر مختصر لیکن واضح انداز سے تشریحی و توضیحی نظر بھی ڈالی ہے شاعری کی اس تقسیم سہ گانہ کے بعد انھوں نے حماسی شاعری کی مزید درجہ بندی کی ہے ان کے نزدیک شعر حماسی کو بھی دو الگ الگ عنوانات کے تحت تقسیم کیا جا سکتا ہے (۱) منظومہ ہائے حماسی طبیعی و ملی (۲) منظومہ ہائے حماسی مصنوع۔ افہام موضوع کے واسطے انھوں نے ان دو قسموں کو بھی مزید تین قسموں میں تقسیم کیا ہے (۱) حماسہ ہائے اساطیری و پہلوانی (یہ نوع شاعری حماسہ طبیعی و ملی ہی کی ایک شاخ ہے) (۲) منظومہ ہائے حماسی تاریخی (۳) منظومۂ حماسیٔ دینی ۔

ڈاکٹر صفا کی اس کتاب کا اصل موضوع بحث منظومہ ہائے اساطیری و پہلوانی (یعنی حماسۂ طبیعی و ملی) ہے۔ رزمیہ نظموں کی اس تقسیم کے بعد انھوں نے رزمیہ شاعری کی خصوصیات سے سیر حاصل بحث کرتے ہوئے اس کی ایک ایک خصوصیت کو واضح و نمایاں کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے اور جہاں تک ممکن ہو سکا ہے فرانسیسی زبان کی جدید ترین تحقیقات سے بھی قدم قدم پر استفادہ کیا ہے۔ اس سلسلہ میں وہ جگہ جگہ پر چونکا دینے والے انکشافات بھی کرتے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر ان کا یہ انکشاف پیش کیا جاتا ہے۔

"لازمۂ یک منظومۂ حماسی تنہا جنگ و خوں ریزی نیست بلکہ منظومۂ کامل حماسی آنست کہ در عین توصیفِ پہلوانیہا و مردانگیہائے قوم نمایندۂ عقاید و آراء و تمدن او نیز

صرف جنگ و خوں ریزی (کا بیان ہی) کسی رزمیہ نظم کی ناگزیر خصوصیت نہیں ہے بلکہ مکمل رزمیہ نظم وہ ہے جس میں کسی قوم کی بہادری اور مردانگی کی تعریف و توصیف کے ساتھ ساتھ اس قوم کے خیالات، عقائد اور تمدن

باشد و این خاصیت در تمام
منظومہ ہائے حماسی مہم جہاں
موجود است و من نمو داری را از
شاہنامہ در این جا نام می برم در
شاہنامہ تنہا از جنگہائے ایرانیان
و تورانیان و نبرد و ستیز آدمیان
و دیوان و نظائر این امور سخن نمی رود
بلکہ این منظومہ جامع جمیع خصائصِ
مدنی و اخلاقی و فرہنگی ایرانیانِ قدیم
نیز ہست۔ در ہمان حال کہ ما با خواندن
شاہنامہ از نبردہائے ایرانیان
برائے فتح ایران و استقرار خود
در این سرزمین و تحصیل استقلال
و ملیت در قبال ملل مہاجم جدید و
امثالِ این امور آگہی می یابیم،
در ہمان حال ہم از مراسم اجتماعی
و از تمدن و مظاہر مدنیت و اخلاقِ
ایرانیان و مذہبِ ایشان و حتی
از عشق بازیہا و میگساریہا و
لذائذ و خوشی ہائے پہلوانان و بحث ہائے
فلسفی و دینی آنان و نظائر اینہا نیز
مطلع می شویم[1] "

کا بھی بیان ہو۔ یہ خصوصیت دنیا کی تمام عظیم
رزمیہ نظموں میں موجود ہے۔ اس
سلسلے میں نمونہ کے طور پر میں شاہنامہ کا
نام لوں گا۔ شاہنامہ میں صرف
ایرانیوں اور تورانیوں دیووں اور
انسانوں اور اسی قبیل کی دوسری
جنگوں کا حال نہیں بیان کیا گیا ہے
بلکہ یہ نظم قدیم ایرانیوں کی تمام تہذیبی،
اخلاقی اور تمدنی خصوصیات کی بھی عکاس
ہے۔ اگر ایک طرف ہم شاہنامہ کے
مطالعہ سے ایران کو فتح کرنے کے لیے
ایرانیوں کی جنگوں اور ان کی کوششوں
سے واقف ہوتے ہیں جو انھوں نے اس
سرزمین میں اپنے پیر جمانے اور نئی حملہ
آور قوموں سے خود کو بچانے اور اپنی
آزادی برقرار رکھنے کے سلسلے میں کی ہیں تو
دوسری طرف ایرانیوں کے اجتماعی رسم و رواج
تمدن تہذیب اور اخلاق و مذہب سے بھی واقف ہوتے
ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ ان کی عشق بازی، شراب
نوشی، پہلوانوں کے عیش و عشرت کے ساتھ ساتھ
ان کے مذہبی اور فلسفیانہ مباحث جیسی اور بہت
سی چیزوں سے بھی مطلع ہوتے ہیں۔

اس اقتباس کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صفا کے نزدیک

---

[1] بحوالہ سابق ص ۹

وہ حماسی منظومات جو کسی قوم یا فرد کی جنگ جوئی اور خوں ریزی کی داستان ہی بیان کرنے پر اکتفا کرتی ہیں مکمل اور بھرپور رزمیہ نظمیں کہلانے کی مستحق نہیں ہیں۔ مکمل اور بھرپور رزمیہ شاعری صرف وہی شاعری ہے جس میں خوں ریزی اور جنگ جوئی کی داستان کے ساتھ ساتھ کسی قوم یا فرد کے عقیدوں، رایوں اور اس کے تہذیب و تمدن کی بھی پوری طرح عکاسی کی جائے ان کے نزدیک عالمی ادب کی تمام عظیم رزمیہ نظمیں ان ہی خصائص سے عبارت ہیں۔ ڈاکٹر صفا نے اپنی اس بات کی تصدیق کے لیے فردوسی کے شاہ نامہ کا نام مثال کے طور پر لیا ہے۔ ان کے خیال میں فردوسی کے اس شاہ کار میں صرف ایرانیوں اور تورانیوں کی جنگوں اور مافوق الفطرت ہستیوں کا انسانوں پر غلبہ پانے کی کوششوں جیسی چیزوں ہی کو نظم کے قالب میں نہیں ڈھالا گیا ہے بلکہ اس عظیم رزمیہ نظم میں قدیم ایران کے تمام تہذیبی، تمدنی اور اخلاقی خصائص کو شعر کے قالب میں جلوہ گر کر دیا گیا ہے۔ اگر ایک طرف ہم کو شاہ نامہ کے مطالعہ سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ کس طرح ایرانیوں نے اپنے وطن کی سرزمین کو بچانے کے لیے مخالف طاقتوں سے جنگ کی اور کس طرح اپنی ملیت کو برقرار رکھتے ہوئے ایک پائدار اور مستحکم حکومت کی بنیاد ڈالی تو دوسری طرف اسی شاہ نامہ کے مطالعہ سے اس بات کا بھی پتہ چل جاتا ہے کہ اس زمانے کی اجتماعی زندگی کیسی تھی؟ لوگوں کے ایک دوسرے سے تعلقات کی نوعیت کیا تھی؟ ایرانیوں کا مذہب کیا تھا؟ اس مذہب کے مخصوص عقائد کس محور کے گرد گردش کرتے تھے؟ صرف یہی نہیں بلکہ اگر ہم چاہیں کہ اس عظیم رزمیہ نظم کی مدد سے اس معاشرہ کے اندازِ عشق اور طریقِ مے گساری سے آگاہ ہوں یا اس زمانے کے فلسفیانہ اور مذہبی مباحث سے مطلع ہوں تو بھی شاہ نامہ ہی کے مطالعہ سے ان تمام باتوں کا علم حاصل کیا جا سکتا ہے ڈاکٹر صفا کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ فردوسی کی یہ رزمیہ نظم صرف جنگ جوئی اور خوں ریزی کی داستان نہیں ہے بلکہ قدیم ایران کی تمدنی، اخلاقی، تہذیبی، سیاسی اور معاشرتی، منظوم تاریخ بھی ہے۔ ایک اعلیٰ درجہ

کی رزمیہ کو اِن ہی خصائص کا حامل ہونا چاہیے اور اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ فردوسی کا شاہ نامہ، رزمیہ کے تمام اعلا خصائص سے متصف ہے۔

گذشتہ صفحات میں عرض کیا جا چکا ہے کہ ڈاکٹر صفا کے خیال کے مطابق کسی ادب کا مطالعہ اس کے تمدن سے صرف نظر کر کے نہیں کیا جاسکتا غالبًا اپنے اِسی نقطۂ نظر کی وجہ سے انھوں نے رزمیہ شاعری کی ایک لازمی خصوصیت یہ بھی قرار دی ہے کہ وہ اپنے تہذیب و تمدن اور معاشرت کی عکاس ہو۔ ڈاکٹر صفا کے اس نقطۂ نظر کی وجہ سے ادبیات کا دائرہ بہت وسیع ہو جاتا ہے اور ادبیات صرف ایک فن لطیف Fine Art ہی نہیں رہتا بلکہ وہ سماجی علوم کی سرحد میں داخل ہو جاتا ہے جس کی مدد سے افراد اور قوموں کی سرگذشتوں کی الجھی ہوئی کڑیوں کو نہ صرف سلجھایا جاسکتا ہے بلکہ ان کی بازیافت بھی کی جاسکتی ہے۔ ڈاکٹر صفا نے ادبیات کا مطالعہ اسی نقطۂ نظر سے کیا ہے کہ اس کی مدد سے تاریخ، تہذیب و تمدن اور معاشرت کی گم شدہ کڑیوں کی بازیافت کر کے ایرانی قوم کے تاریخی تسلسل کو ادبیات کے ذریعہ سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کریں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ اپنی اس کوشش میں نہ صرف کامیاب ہیں بلکہ مطالعۂ ادب کے ایک مکتبِ نو کے بانی بھی کہے جاسکتے ہیں۔ اس مکتبِ نو کے وجود میں آنے کے بعد اب شاہ نامہ یا اسی قبیل کی دوسری منظومات کا مطالعہ صرف اعلا درجے کی شاعری کے نمونے کے طور پر نہیں کیا جاتا بلکہ ان کے ذریعہ تاریخ کے سربستہ رازوں کو بے نقاب اور گم شدہ کڑیوں کی بازیافت بھی کی جاتی ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ ادبیات ہی کے ذریعہ گذشتہ زمانے کے مذہبی رسوم و عقائد، ان کے اوہام، فلسفیانہ اور اخلاقی مباحث، طریقِ بود و باش، اندازِ رندی و سرمستی کو بھی بے نقاب دیکھا جاسکتا ہے۔ ان منظومات میں جنگ جوئی اور خوں ریزی کی جو داستانیں نظم کی گئی ہیں اس وسیع کینوس میں ان کی حیثیتِ ثانوی ہو کر رہ جاتی ہے اور ان منظومات کے

مطالعہ کا اصل مقصود و مدعا یہ قرار پاتا ہے کہ اب سے ڈیڑھ ہزار سال یا اس سے بھی پہلے کے ایران کے رہنے والوں کے مذہبی عقائد و رسوم، حکیمانہ افکار و مباحث، اخلاقی و روحانی نظام، تفریح طبع کے مختلف طریقے، خوشی و غم کے مواقع پر ان کے عمل اور ردِ عمل تک رسائی حاصل کی جائے اور یہ دیکھا جائے کہ اس ڈیڑھ ہزار سال کے عرصہ میں انسانی کارواں کس حد تک آگے بڑھ چکا ہے اور اس طویل عرصہ میں اس نے کیا کھویا اور کیا پایا ہے؟ اس نقطۂ نظر سے جب ہم ڈاکٹر صفا کے افکار اور ان کی تصانیف کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم کو محسوس ہوتا ہے کہ تاریخ کی وہ کڑیاں جن کو اب تک گمشدہ سمجھا جاتا رہا ہے ایک دوسرے سے ملتی جا رہی ہیں اور وہ باہم پیوست و مربوط ہو کر اس تاریخی تسلسل کو ظاہر کرنے لگی ہیں جن سے گذر کر انسانی کارواں موجودہ عہد کی منزل تک پہنچا ہے۔ اس طویل سفر میں انسانی کارواں کو سود و زیاں دونوں سے دوچار ہونا پڑا۔ کبھی سود کا پلڑا بھاری رہا تو کبھی زیاں کا مگر انسانی کارواں آگے ہی بڑھتا رہا، کبھی اس نے اپنے افکار و آرار کا تراشا خراشا کچھ چیزوں کو نکال باہر کیا، کچھ نئی چیزوں کو اپنے اندر جذب کر لیا، اس پیہم عمل اور ردِ عمل کے باوجود انسانی کارواں آگے کی طرف بڑھتا ہی رہا، خونریزیوں سے گزرتا، ہولناکیوں، اور تباہیوں سے نبرد آزما ہوتا، کشاکش و کشمکش کے مراحل سے دوچار ہوتا ہوا عہد حاضر کے اُس وسیع میدانِ کارزار میں داخل ہو گیا ہے جہاں اسے بہت سے نئے نئے چیلنجوں کا سامنا کرتے ہوئے آگے ہی بڑھتے چلے جانا ہے۔ انسانی کارواں کے لیے چیلنجوں کا سامنا کوئی نئی، انوکھی یا صرف اسی عہد سے متعلق بات نہیں ہے بلکہ اس کا سلسلہ تو حیاتِ انسانی کے آغاز ہی کے ساتھ سے اپنے بھیانک روپ میں شروع ہو گیا تھا۔ چیلنجوں کے اس بھیانک روپ کی تشریح توضیح اور تعبیر کی شکلیں ہر دور کے ادبیات کے آئینہ میں دیکھی جا سکتی ہیں اور اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کس دور کا انسان کس قسم کے داخلی اور خارجی چیلنجوں سے نبرد آزما ہوتا ہوا ارتقار کی راہ پر گامزن ہوا تھا؟ اس مطالعہ کے ذریعہ سے ادبیات کو نہ صرف تاریخ کا ایک حلیف موضوع بنایا جا سکتا ہے بلکہ اس کی مدد سے تاریخ کے بہت سے الجھے ہوئے مسائل کو سلجھایا بھی جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا کا یہی مطمحِ نظر ہے اور "حماسہ سرائی در ایران" اسی مطمحِ نظر کا ایک

اعلیٰ مظہر ہے۔

ڈاکٹر صفا نے ان روایتوں اور صنمیات کی بھی نشاندہی کی کوشش کی ہے جو ہندوستانیوں اور ایرانیوں میں مشترک ہیں۔ انھوں نے اپنے اس مطالعہ کی ابتدا اس زمانے سے کی ہے جب موجودہ ایرانیوں اور ہندوستانیوں کے آباء و اجداد (آریا) ایک جگہ رہتے سہتے اور ایک مذہب کے پیرو تھے۔ یہ آریا جب ایران آئے اور وہاں کی مقامی آبادی کو مغلوب کرکے ان پر حکمران ہوئے تو انہی کے اثر سے وہ اساطیری روایتیں جو پشتہا پشت سے سینہ در سینہ ہوتی ہوئی ان تک پہنچی تھیں، ایران میں بھی عام ہونے لگیں۔ مثال کے طور پر ڈاکٹر صفا نے جمشید، فریدوں، فریدوں کے باپ آبتین کی داستانوں کی طرف اشارہ کیا ہے جو ہندوستانیوں اور ایرانیوں دونوں میں مشترک ہیں لیکن وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ دونوں ملکوں کی داستانوں میں اتنا تغیر و تبدل ہو گیا ہے کہ اب یہ داستانیں بالکل الگ الگ داستانیں معلوم ہونے لگی ہیں۔ اساطیری روایات کے علاوہ آریوں کی بہت سی مذہبی روایات کا بھی ایران میں چلن عام ہوا اور ظہورِ زردشت تک اس سلسلہ میں پیشرفت ہوتی رہی۔ ظہورِ زردشت کے بعد اگرچہ پیش رفت کا سلسلہ تو ختم ہو گیا مگر ایران کی سرزمین پر ان کا وجود بہرحال باقی رہا اور آج بھی کسی نہ کسی شکل میں ان کا وجود دیکھا جا سکتا ہے۔ آریوں کے دوسرے گروہ کے ذریعہ یہی مذہبی روایات ہندوستان بھی پہنچیں لیکن جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے جغرافیائی تبدیلی اور حالات کے تقاضوں کے تحت ایرانی اور ہندوستانی آریوں کی مذہبی روایات میں اتنا بُعد ہو گیا کہ وہ دو جداگانہ مذہبی روایات معلوم ہونے لگیں۔

ایران کی حماسہ سرائی کی ابتدا اسی زمانے سے ہوتی ہے۔ آریوں نے اپنی قومی روایتوں، مذہبی عقیدوں، تاریخی حقیقتوں اور اپنے جواں مردوں کی جاں بازیوں کی ان تمام داستانوں کو محفوظ کر لینے کی سعی کی جن کو وہ اپنے ساتھ لائے تھے۔ ان روایتوں میں آریوں کی برتری، بہادری اور جواں مردی حسب و نسب پر فخر و غرور کے قصے بھی ہیں اور مذہبی و تاریخی واقعات کا بیان بھی۔ ظہور زردشت کے بعد جب بیشتر آریوں نے زردشتی مذہب کو

قبول کرلیا اور اپنے قدیم دین سے دست بردار ہو گئے تو اس جدید مذہب کے عقائد اور آریوں کی قدیم روایات کے امتزاج سے ایراُن کے "حماسۂ ملی" کی بنیاد پڑی۔ ڈاکٹر صفا کے خیال میں جس وقت امتزاج کا یہ عمل شروع ہوا، اس وقت یہ داستانیں اور روایتیں اساطیری اور مذہبی تھیں لیکن وقت کے گذرنے کے ساتھ ساتھ جب یہ روایتیں اور داستانیں منظوم ہونے لگیں تو حالات کے تقاضوں کے تحت ان کے مذہبی عناصر کو کم کر کے قومی اور ملی منظومات کی شکل میں پیش کیا گیا۔

ڈاکٹر صفا کے خیال میں 'اوستا' وہ اولین اور قدیم ترین کتاب ہے جس میں ایران کی ملی اور رزمیہ داستانیں یکجا کر دی گئی ہیں جن شواہد کی بنا پر ڈاکٹر صفا نے یہ نظریہ قائم کیا ہے اس کا ایک مختصر سا خلاصہ لکھا جا رہا ہے تاکہ ان کی بات کو سمجھنے میں آسانی ہو۔

اوستا، زردشتیوں کی مذہبی کتاب ہے جس کو اب پانچ نسک (ابواب یا کتاب) میں تقسیم کیا جاتا ہے یعنی ۱۔ وندیداد ۲۔ یسنا ہا ۳۔ یشتہا ۴۔ خردہ اوستا۔ ۵۔ ویسپرد۔ معلوم ہوتا ہے کہ کتاب اوستا کے بہت سے حصے محفوظ نہیں رکھے جا سکے کیونکہ پہلی صدی عیسوی کے ایک رومی مؤرخ پولینوس نے لکھا ہے کہ ہرمیپوس نامی یونانی مؤرخ نے زردشت کے عقائد کی تشریح و توضیح وتعبیر کے لیے خود اس کی کتاب سے استفادہ کیا تھا جو اس زمانے میں بیس جلدوں پر اور ہر جلد ایک لاکھ اشعار پر مشتمل تھی۔ پولینوس کی اس بات کی تصدیق 'نامۂ تنسر' کے مندرجات سے بھی ہوتی ہے جو اردشیر بابکان کے عہد کی تصنیف ہے جس میں اس حقیقت پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ سکندر نے ایران کو فتح کرنے کے بعد کس طرح زردشتی مذہب کے آثار کو جلا ڈالا تھا۔ سکندر کے حملے کے بعد اس ضخیم ترین کتاب کے اجزا منتشر ہو گئے اور لوگوں کو صرف وہی روایات یاد رہ سکیں جو قدیم زمانے سے سینہ بسینہ چلی آرہی تھیں۔ اوستا کے وہ منتشر حصے جو ضائع ہونے سے بچ گئے تھے ان کو اشکانی عہد کے اواخر اور ساسانی عہد کے اوائل میں اکیس نُسکوں میں مرتب کر لیا گیا لیکن یہ اوستا بھی عربوں کے حملے

ے زمانے میں منتشر ہوگئی بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ تقریباً نابود ہوگئی صرف اس کا وہ خلاصہ باقی بچ سکا جو کتاب 'دین کرت' میں مندرج تھا اس خلاصہ کے علاوہ اس اوستا کے چند ٹکڑے بھی باقی رہ گئے تھے جو اشکانیوں اور ساسانیوں کے زمانے میں مرتب ہوئی تھی۔

ڈاکٹر صفا نے مرحوم ابراہیم پور داؤد کے حوالے سے زردشت کا عہد دسویں صدی قبلِ مسیح قرار دیا ہے اور اسی لیے یسنا کے اس حصے کو جو گاتھا کے نام سے معروف ہے اور خود زردشت کا نوشتہ تبلایا جاتا ہے، اوستا کا قدیم ترین حصہ قرار دیا ہے۔ اوستا کے دوسرے ابواب (نُسکھا) کے زمانۂ ترتیب کی تعیین تو ان کے نزدیک بہت دشوار ہے لیکن موجودہ اوستا کے جو پانچ نُسک باقی رہ گئے ہیں ان میں 'یسنا ہا' قدیم ترین ہیں۔ اس کے بعد 'یشتہا' کے کچھ حصے قدیم تر قرار دیے جا سکتے ہیں جن کی ترتیب کے بارے میں بعض قرائن کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کو ہخامنشیوں کے عہد سے پہلے ہی مرتب کر لیا گیا تھا۔

موجودہ اوستا کے ابواب (نسکھا) میں جو قدیم ترین روایات محفوظ ہیں ان میں باہم دگر اختلافات موجود ہیں۔ اس سلسلے میں یہ بات خاص طور سے یاد رکھنے کی ہے کہ خردہ اوستا اور ویسپرد میں اِن روایات کو محفوظ رکھنے کا التزام نہیں کیا گیا ہے البتہ وندیداد، یسنا ہا اور یشتہا میں یہ روایات محفوظ ہیں مگر جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے اِن روایات میں باہم خاصہ فرق اور اختلاف ہو گیا ہے اِن میں بھی 'یسنا ہا' میں قدیم ترین روایات کم ہی ہیں البتہ اس میں بعض ایسی روایات ضرور ملتی ہیں جن کی مدد سے قدیم ہندوؤں اور ایرانیوں (آریوں) کی روایات و عقائد کا تقابلی مطالعہ کیا جا سکتا ہے اور ان اساطیر اور ہیروؤں کے بارے میں بھی علم حاصل کیا جا سکتا ہے جو دونوں قوموں کے مشترکہ میراث تھے۔

ڈاکٹر صفا کے نزدیک ہمارے موضوع کے لحاظ سے اوستا کا وہ حصہ سب سے زیادہ اہم اور مفید مطلب ہے جو یشتہا کے نام سے موسوم ہے۔ یہی وہ حصہ ہے جس میں یران کی قدیم ترین ملی روائتیں اور رزمیہ داستانیں محفوظ رہ سکی ہیں۔ اوستا کے اس حصے کے ذریعے سے ہم کو ہوشنگ، جمشید، ضحاک، فریدوں، گرشاسپ، نوذر،

افراسیاب، کیکاؤس، کیخسرو جاماسپ ارجاسپ وغیرہ کے بارے میں بھی ہم کو علم ہوتا ہے۔ یہ تمام معلومات اس یشت سے حاصل ہوتی ہیں جو آبان یشت کے نام سے موسوم ہے۔ ڈاکٹر صفا نے اس یشت کے بارے میں لکھا ہے کہ:

"آبان یشت اصلاً مختص است بستائشِ" اردویسور اناہیت (ناہید) فرشتۂ آب و نخستین قسمت از اجزار دوگانۂ آں نیز کاملاً حاوی ہمیں معنی است امادر جزر دوم از ستایندگانِ ناہید یعنی پادشاہان و پہلوانان ونامداران وداستان آنان سخن رفتہ و ازیں جہت یکے از مہم ترین قسمت ہائے اوستا است کہ در آن داستان ہائے ملی ایران قدیم یعنی اساس حماسۂ ملی ما تدوین شدہ است[1]"

آبان یشت دراصل پانی کے فرشتہ " اردویسور اناہیت (ناہید) کی مدح و ستائش کیلئے مختص ہے۔ اس یشت کا پہلا حصہ کاملاً اسی مدح و ستائش پر مشتمل ہے۔ لیکن اس کے دوسرے حصے میں ان بادشاہوں پہلوانوں اور بڑے بڑے لوگوں کی بھی داستانیں بیان کی گئی ہیں جو اناہیت کے عقیدت مند تھے۔ اس لحاظ سے یہ حصہ اوستا کے اہم ترین حصوں میں شمار ہوتا ہے جس میں قدیم ایران کی وہ ملی داستانیں جمع کردی گئی ہیں جن پر ہماری ملی رزمیہ نگاری کی بنیاد رکھی گئی ہے۔

اس یشت کے علاوہ بھی بعض ایسے یشت اور بھی ہیں جن میں ایران کے اور دوسرے قدیم بادشاہوں اور ہیروں مثلاً گیومرث، تہماسپ اور منوچہر وغیرہ کے ناموں اور کارناموں کا ذکر ملتا ہے۔ اوستا کے اسی حصے میں بعض وہ داستانیں بھی محفوظ ہیں جو آج بھی فارسی ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں مثلاً بارھویں یشت میں سیمرغ کا قصہ بھی محفوظ ہے جس کو ظہورِ اسلام کے بعد کے فارسی شاعروں نے نظم کرکے زندۂ جاوید بنا دیا ہے۔

ان تمام باتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ڈاکٹر صفا نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اوستا

---

[1] بحوالہ سابق ص ۳۵

ایران کی قدیم ترین ملّی اور حماسی کتاب ہے۔

ڈاکٹر صفا ایران کے وہ پہلے ادیب اور محقق نہیں ہیں جنھوں نے اوستا کو اپنے مخصوص مطالعہ کا ہدف بنایا ہو۔ ان سے کافی عرصہ پہلے مرحوم ابراہیم پورداؤد اوستا کی تفہیم، تعبیر، تشریح و توضیح کے لیے اپنی زندگی وقف کرچکے ہیں۔ پورداؤد نے زردشت کے عہد پر بھی تحقیقی کام کیا ہے اور موجودہ اوستا کے حصوں کا مفید حواشی کے ساتھ فارسی میں ترجمہ بھی کیا ہے ان سے جہاں تک ممکن ہو سکا انھوں نے اپنی پوری عمر اسی کام میں صرف کی لیکن ڈاکٹر صفا اور مرحوم پورداؤد کے نقطۂ نظر میں ایک فرق یہ ہے کہ پورداؤد نے اوستا کو ایک مذہبی صحیفہ مانتے ہوئے اس کی تشریح و تعبیر کی ہے جبکہ ڈاکٹر صفا کے نزدیک اوستا کی بنیادی اہمیت یہ ہے کہ یہ ایران کی اولین اور قدیم ترین قومی رزمیوں کا مجموعہ ہے جس کی مدد سے ایران کی قدیم ترین تاریخ، تہذیب اور تمدن کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر صفا نے اپنے اسی نقطۂ نظر کے مطابق کتابِ اوستا کا مطالعہ بھی کیا ہے۔ انھوں نے یشتہا سے مثالیں دیتے ہوئے ان تمام رزمیوں کی طرف واضح اشارے کردیے ہیں جو اس کتاب میں جا بجا بکھرے ہوئے ہیں جن میں خیر و شر، ایرانیوں اور مازندرانی دیووں (دیووں سے مراد پرلے درجے کے بدمعاشوں سے ہے)، ایرانی اور تورانی لڑاکوں کی جنگوں کا حال تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

اوستا کا تفصیلی اور ایک نئے نقطۂ نظر سے مطالعہ کرنے کے بعد ڈاکٹر صفا نے پہلوی ادبیات کے ان منظوم رزمیوں کا جائزہ لیا ہے جن کی داستانوں نے آگے چل کر بالخصوص ظہورِ اسلام کے بعد نئے نئے قالب اختیار کیے اس سلسلے میں سب سے پہلے انھوں نے پہلوی ادبیات کی مشہور ترین کتاب "یادگار زریر" پر تفصیلی بحث کی ہے اس کتاب سے بحث کرتے ہوئے ڈاکٹر صفا نے نہایت ایمانداری کے ساتھ یہ انکشاف کیا ہے کہ اب سے پینتیس چالیس سال پہلے تک ایرانی ادبیات کے محققین کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ "یشتہا" اور ان منظومات رزمیوں کی درمیانی کڑی کو کہاں تلاش کیا جائے جو ظہورِ اسلام کے بعد کی یادگاریں ہیں۔ خوش قسمتی سے ۱۹۳۲ء میں ایک فرانسیسی مستشرق بنونیسٹ Benevniste نے سب سے

پہلی بار اپنی محققانہ دیدہ وری سے یہ ثابت کر دیا کہ " ایاتکار زریران" (یادگار زریران) نامی رزمیہ کتاب منظوم ہے منثور نہیں۔ اس انکشاف کے بعد اوستائی رزمیوں اور ظہورِ اسلام کے بعد کے رزمیوں کی وہ درمیانی کڑی بھی ہاتھ آگئی جس کی گم شدگی کی وجہ سے تاریخ ادبیات ایران کے ایک گوشے کو سمجھنا مشکل ہو رہا تھا۔ یہ کتاب گشتاسپ کے بھائی زریر کے نام سے موسوم ہے جس کو چھٹی صدی عیسوی میں ایک قدیم نسخے سے نقل کر کے مدون کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر صفا کے خیال میں مشرقی ایران کی روایات پر مبنی جو " یشتہا" ضائع ہو گئے تھے، اصل کتاب " یادگار زریر" ان ہی مفقود یشتوں میں سے ایک یشت پر مبنی تھی۔

یادگارِ زریر آج جس صورت میں ہمارے سامنے ہے وہ اشکانی عہد کی یادگار ہے لیکن ساسانی عہد میں آکر اس میں تھوڑا بہت تغیر و تبدل بھی ہو گیا ہے۔ بہر حال یہ نظم مذہبی نظم ہونے کے ساتھ ساتھ رزمیہ کی تمام خصوصیات کی حامل ہے جس میں خوں ریزی، جنگ و جدل، کشت و پیکار کی بھی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔ اس نظم کا خاص موضوع زردشتی مذہب کے سلسلے میں ایرانیوں اور تورانیوں کی آپسی پیکار ہے جس کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

ظہور زردشت کے بعد گشتاسپ اور اس کے پیرووں نے زردشتی مذہب کو قبول کر لیا۔ جب یہ خبر خیونان (ترکان) کے بادشاہ ارجاسپ کو ملی تو وہ بہت برافروختہ ہوا۔ اس نے اپنے دو خاص مقربین بارگاہ " ویدرفش جادو" اور " نامخواست ہزاران" کو گشتاسپ کے پاس اس پیام کے ساتھ بھیجا کہ وہ زردشتی مذہب کو خیرباد کہہ دے۔ گشتاسپ اس بات پر راضی نہیں ہوا اور اپنے بھائی زریر کے مشورہ سے ارجاسپ سے جنگ کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ چنانچہ اس نے اپنی فوج کو جمع کیا اور تورانیوں پر حملہ آور ہو گیا۔ گشتاسپ کا بھائی زریر ہی اسکی فوج کا سپہ سالار تھا، اس نے میدانِ کارزار میں اپنی شجاعت کے خوب جوہر دکھائے مگر بدقسمتی سے " ویدرفش جادو" کے ہاتھوں مارا گیا۔ زریر کا ایک لڑکا بستور بھی اسی فوج میں تھا اس نے اپنے باپ کے خون کا بدلہ لینے کی ٹھان لی وہ " ویدرفش جادو" کے مدمقابل ہوا اور اپنی بہادری اور فنی مہارت سے نہ صرف

اپنے باپ کے قاتل پر غالب ہوا بلکہ اس کو مار بھی ڈالا۔ اُس کے مرنے کے بعد تورانی فوج میں بھگدڑ مچ گئی اور تورانی پسپا ہوگئے نتیجہ کے طور پر ارجاسپ بھی توران بھاگ گیا۔

اس پہلوی کتاب نے فارسی ادبیات پر اپنے بڑے گہرے نقوش چھوڑے ہیں دقیقی نے ارجاسپ اور گشتاسپ کی جس جنگ کو نظم کیا ہے اس کا مواد "یادگار زریر" ہی سے مستفاد ہے۔ اس حقیقت کے باوجود ڈاکٹر صفا کو اس بات کے ماننے میں تامل ہے کہ دقیقی نے صرف یادگار زریر کے پہلوی نسخہ ہی سے استفادہ کیا ہے ان کے تامل کی وجہ یہ ہے کہ اگرچہ یادگار زریر اور شاہنامۂ دقیقی میں بہت سی مماثلتیں ہیں لیکن اسی کے ساتھ ساتھ ان دونوں کتابوں کی روایتوں میں بہت سے اختلافات بھی موجود ہیں اور ان ہی اختلافات کی موجودگی کی وجہ سے ڈاکٹر صفا نے اپنا یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ دقیقی نے صرف یادگار زریر ہی سے استفادہ نہیں کیا ہے بلکہ اس کے سامنے ابومنصوری کا منثور شاہنامہ بھی تھا جس سے وہ جگہ جگہ پر استفادہ کرتا گیا ہے۔ ہم یہاں پر مثال کے طور پر یادگار زریر کی ایک عبارت اور دقیقی کے چند اشعار نمونہ کے طور پر پیش کرتے ہیں جس سے ڈاکٹر صفا کے نظریہ کو سمجھنے میں آسانی ہوگی —

یادگار زریر کی ایک عبارت کا فارسی ترجمہ ملاحظہ ہو:

"کسیست کہ شود باز ریر کوشد و آں سپہبد را کشد، تا دخت خود زرستان را بزنی بدو دہم کہ اندر ہمۂ کشور از و ہز برتر نیست و اورا وزیرِ خویش کنم۔ چہ اگر زریر زندہ ماند دیری برنمی آید کہ از ما خیونان ہیچک زندہ نماند۔ پس دیدرفش جادو برپائے ایستاد و فرمان داد کہ اسپ زیں کنند و یدرفش جادو بر اسپ نشست آں زوبین جادوئے بخشم و زہر ساختہ

کوئی ہے جو زریر سے نبرد آزمائی کرے اور اس سپہ سالار کو مار ڈالے، تاکہ میں اپنی لڑکی زرستان کو جس کی ہنرمندی کی نظیر پورے ملک میں نہیں ہے، اس کی زوجیت میں دیدوں اور اس کو اپنا وزیر بنالوں، کیونکہ اگر وہ زندہ رہا تو ہم خیونوں میں سے کوئی بھی فوزیادہ دنوں تک زندہ نہ رہ سکے گا۔ اس بات کو سن کر جادوگر دیدرفش اس کام پر آمادہ ہوا اور اس نے اپنے گھوڑے کو تیار کرنے کا حکم دیا۔ پھر اس پر سوار ہوا اور اس نے اپنے ہاتھ میں وہ جادوئی نیزہ بھی لے لیا جو زہر آلود تھا۔

را بر سر دست گرفت و اندر رزم — اس کے بعد وہ میدان جنگ کی طرف دوڑ گیا
دوید و چوں دید کہ زریر آنگونہ کارزار — اس نے وہاں جاکر زریر کے طریق جنگ کا مشاہدہ
کند پیش او فراز نہ شد و از پس — کیا، پھر وہ اس کے سامنے نہیں گیا بلکہ پیچھے
او برجست و زوبین زہر آبدار را — سے اس پر حملہ آور ہوا اور بیدرفش نے زریر کی
زیر شمشیر بند بالائے کُستی بہ پشت — پشت پر اپنا زہر آلود نیزہ مارا جو زریر کے دل
او بزد۔ بدل بگذشت و بزمین افگندش[1] — کے پار ہو گیا اور وہ زمین پر گر پڑا۔

اسی روایت کو اب دقیقی کی زبان سے سنئے:

چو ارجاسپ دانست کان پورِ شاہ — بسی نامداران کہ گردش تباہ
بدان لشکر خویش آواز داد — کہ بر داد خواہید خلخ بباد
کنون اندر آمد میانشان زریر — چو گرگ دژآگاہ و دَرّندہ شیر
کدامست مرد از شما نام خواہ — کہ آید پدید از میان سپاہ
بیامد پس آں بیدرفش سترگ — پلیدی سگی جادوئے پیر گرگ
بارجاسپ گفت اے بزرگ آفتاب — بہ بیخ و بہ بُن ہم چو افراسیاب
بہ پیش تو آوردم ایں جانِ خویش — سپر کردم ایں جان شیریں بہ پیش
ازو شاد شد شاہ و کرد آفریں — بدادش بدو بارۂ خویش و زیں
ہمان نیزہ زوبین زہر آبدار — کہ بر آہنین کوہ کردی گذار
شد آں جادوئے زشت ناپاک تن — نبرد زریر آں سر انجمن
چو از دور دیدش براں سہم و خشم — پُر از خاک ریش و پُر از گرد چشم
نیارست رفتن دراپیش روی — ز پنہاں ہمی تاخت برگردِ اوی
ز پنہاں برآں شاہزادہ سوار — بینداخت زوبین زہر آبدار
گذارہ شد از خسروی جوشنش — بخون ترشد آں شہریاری تنش
بیفتاد زاسپ اندرون شہریار — دریغ آن جوان شاہزادہ سوار[2]

یادگار زریر کی عبارت اور دقیقی کے اشعار کے تقابلی مطالعے سے یہ بات

---

[1] بحوالۂ سابق ص ۱۲۷-۱۲۸ [2] ص ۱۲۸

واضح ہو جاتی ہے کہ دقیقی نے اپنی داستان کی اساس اسی داستان پر رکھی ہے جو یادگار زریر میں مندرج ہے لیکن جزئیات میں جو اختلاف نظر آتا ہے اس کی وجہ غالباً یہی ہے کہ دقیقی کے سامنے ابومنصوری کا منثور شاہنامہ بھی تھا جس کی وجہ سے یادگار زریر اور دقیقی کے اشعار میں یہ فرق اور اختلاف ہو گیا ہے۔ اگر اس موقع پر ڈاکٹر صفا نے اس داستان سے متعلق ابومنصوری کی بھی عبارت نقل کر دی ہوتی تو ہمارے لیے یہ فیصلہ کرنا آسان ہوتا کہ دقیقی کے شاہنامہ کی اساس اصلاً کس کتاب پر ہے؟ ابومنصوری کی عبارت سامنے نہ ہونے کی وجہ سے ہم خود کوئی حتمی رائے قائم کرنے سے قاصر ہیں۔ بہر حال پشتہا کے بعد یادگار زریر (پہلوی زبان کا) وہ اہم ترین منظوم رزمیہ ہے جس کی اساس پر ظہورِ اسلام کے بعد کے فارسی منظوم رزمیے لکھے گئے ہیں اور پہلوی زبان کی اس قابل قدر کتاب کی روایات کو ہمیشہ کے لیے شعر کی شکل میں محفوظ کر دیا گیا ہے۔

اسی سلسلے کی ایک دوسری کڑی، جو پہلوی ادبیات میں خاصی اہمیت کی حامل ہے "کارنامہ اردشیر بابکان" بھی ہے جو موضوع زیرِ بحث سے صرف متعلق ہے بلکہ ایران میں رزمیہ نگاری کے تسلسل پر بھی بڑی اچھی روشنی ڈالتی ہے۔ ساسانیوں کے زمانے میں جو کتابیں لکھی گئی تھیں ان میں سے بیشتر ضائع ہو چکی ہیں لیکن خوش قسمتی سے "کارنامک ارتخشیر پاپکان" کے نسخے ضائع ہونے سے بچ گئے۔ اگرچہ اس کتاب کا شمار منثور رزمیہ کتابوں میں ہوتا ہے لیکن چونکہ اسی کتاب سے استفادہ کرتے ہوئے ظہورِ اسلام کے بعد منظوم رزمیے لکھے گئے ہیں اس لیے اس کتاب کا اجمالی تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

بہت سے قرائن کی بنا پر اکثر محققین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ کتاب ساتویں صدی عیسوی کے اختتام یعنی ۶۰۰ء میں لکھی گئی تھی۔ جس میں اردشیر بابکان کے حالات بیان کرتے ہوئے یہ دکھلایا گیا ہے کہ اس نے ایران کی بادشاہت کس طرح حاصل کی۔ ڈاکٹر صفا کا خیال ہے کہ یہ کتاب اس زمانے میں لکھی گئی ہے جب اردشیر اور اس کے جانشینوں کے بارے میں تاریخی معلومات محفوظ تھیں اور ان ہی معلومات کی روشنی میں اردشیر کے حالات لکھے گئے ہیں لیکن اس کے باوجود

جب ہم اس کتاب کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب بھی دوسری کتابوں کی طرح خوارق، اوہام اور خرافات سے خالی نہیں ہے۔ خوارق و اوہام کی موجودگی اس بات کی دلیل ہے کہ یہ کوئی تاریخی کتاب نہیں ہے لیکن اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی واضح کردینا ضروری ہے کہ اس کتاب کے مصنف کا اصل مقصد یہ بھی نہیں تھا کہ وہ اردشیر کی کوئی نئی اور طبع زاد داستان لکھے بلکہ ہوا یہ کہ اس زمانے تک آتے آتے اردشیر کی تاریخی داستان میں بھی بہت ساری تبدیلیاں ہوگئیں، اس کتاب کے خوارق و اوہام اور رزمیہ عناصر ان ہی تبدیلیوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صفا کے نزدیک اس طرح کے اضافے نئی یا تعجب خیز بات نہیں ہے کیونکہ ہخامنشی خاندان کے بانی کوروش کی موت کے کچھ عرصے بعد ہی سے اس سے بہت سے خوارق اور افسانے موسوم کیے جانے لگے۔ ان خوارق اور افسانوں کو مشہور مورخ ہرڈوٹس نے بھی اپنی کتاب میں نقل کردیا ہے۔

ڈاکٹر صفا نے اس کتاب کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے اس کو یہاں نقل کردینا نامناسب نہ ہوگا۔

"اہمیت کارنامۂ اردشیر بیشتر در آن است کہ ماخذ فصل بزرگی از شاہ نامۂ ابومنصوری یعنی ماخذ مہم شاہ نامہ منظوم فردوسی بودہ است۔ داستانِ اردشیر از آغاز کار یعنی از رویائے بابک و دادنِ دختر بشبانان خود ساسان تا زادن او رمزد پسرِ شاپور از دختر مہرک نوشزاد و شناختن اردشیر او را، در شاہنامۂ ابومنصوری از رسالہ ای برداشتہ شدہ بود کہ علی الظاہر ہمیں کارنامۂ اردشیر بابکان بودہ منتہی نسخۂ کامل تر و

"کارنامۂ اردشیر" کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ یہ کتاب فردوسی کے منظوم شاہنامہ ابومنصوری کے اہم ترین ماخذ یعنی شاہنامہ کا ماخذ رہی ہے۔ اردشیر کا قصہ شروع ہی سے یعنی بابک کے خواب دیکھنے اور اپنی لڑکی کو اپنے گلہ بان ساسان کو سپرد کرنے سے لے کر شاپور کے لڑکے اورمزد کا مہرک نوشزاد کے بطن سے پیدا ہونے اور اردشیر کا اس کو پہچاننے تک کا حال شاہنامۂ ابومنصوری میں ایک رسالہ سے لیا گیا ہے جو بظاہر کارنامۂ اردشیر کا ایک ایسا نسخہ ہے جو مکمل ہونے کے ساتھ ساتھ بہت سی

باتوضیحاتی بیشتر۔

بزرگ ترین دلیل ما بر صحت
این مدعی نزدیکیٔ کامل و ارتباطِ
مستقیمی است کہ میان شاہنامہ
و نسخۂ موجود کارنامۂ اردشیر بابکان
در شرح زندگانیٔ اردشیر دیدہ
می شود۔ برائے نشان دادن ارتباط
و نزدیکیٔ کامل شاہنامہ با کارنامۂ
اردشیر بابکان چند بیت از
شاہنامہ را کہ عینا منطبق بر بعضی
از بندہائے کارنامہ است نقل
می کنیم۔[1]

توضیحات کا بھی حال تھا۔

ہمارے اس دعوے کی صداقت کی
سب سے بڑی دلیل اردشیر کی زندگی کے
حالات کے ضمن میں دیکھی جا سکتی ہے اس
سلسلے کے واقعات کے بیان میں شاہنامہ
اور "کارنامہ اردشیر" میں بے پناہ مماثلت
ملتی ہے۔ شاہ نامہ اور کارنامۂ اردشیر کی
مماثلت کو واضح کرنے کے لیے ہم
شاہنامہ کے چند ایسے اشعار
پیش کرتے ہیں جو کارنامۂ اردشیر
کے بعض بندوں سے مکمل طور سے مماثلت
رکھتے ہیں۔

اس کے بعد ڈاکٹر صفا نے کارنامۂ اردشیر بابکان اور شاہنامۂ فردوسی کا تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے اپنے دعوے کی تصدیق کے طور پر بہت سی مثالیں دی ہیں جن میں سے صرف ایک مثال اس جگہ پیش کی جاتی ہے۔ کارنامۂ اردشیر بابکان کی عبارت کا فارسی ترجمہ یہ ہے۔

"روزے اردوان با سواران
و اردشیر بنخچیر شد۔ گورے اندر دشت
بگذشت۔ اردشیر و پسر بزرگِ
اردوان از پس آں گور تاختند و
اردشیر اندر رسید و تیرے ایدون
بگور زد کہ تیر تا پر بشکم اندر شد و
از دیگر سوئے بگذشت و گور

ایک روز اردوان اپنے سپاہیوں
اور اردشیر کے ساتھ شکار پر گیا۔ جنگل
میں ایک گورخر جا رہا تھا اردشیر اور
اردوان کا بڑا لڑکا اس گورخر کے پیچھے
دوڑے۔ اردشیر اس کے پاس پہنچ گیا اور
گورخر کو ایک تیر اس طرح مارا کہ تیر اس کے
پیٹ میں پیوست ہو کر دوسری طرف نکل گیا اور

۱۔ بحوالہ سابق ص ۱۳۳

برجای بمرد۔ اردوان و سواران فراز رسیدند و از چنان زنش بدان آیین شگفتگی نمودند۔ اردوان پرسید کہ ایں زنش کہ کرد؟ اردشیر گفت کہ من کردم، پسر اردوان گفت کہ نہ چہ من کردم۔ اردشیر بخشم آمد و پسر اردوان را گفت کہ ہنر و مردانگی بہ ستمگری و بے آزرمی و دروغ وبیداد بخویش بستن نتواں ایں دشت نیک و ایدر گور بسیاز من و تو ایدر دیگر آزمائش کنیم و دلیری و چابکی پدید آوریم[1]۔

گورخر وہیں مرگیا۔ اردوان اور تمام سپاہی وہاں پہنچ گئے۔ اور اس طرح کی تیراندازی پر تعجب کا اظہار کرنے لگے۔ اردوان نے پوچھا کہ یہ نشانہ کس نے لگایا ہے؟ اردشیر نے کہا میں نے لگایا ہے، اردوان کے لڑکے نے کہا، نہیں میں نے۔ اردشیر کو غصہ آگیا اور اس نے اردوان کے لڑکے سے کہا، ستمگری، بے شرمی، جھوٹ اور ظلم کی مدد سے، جواں مردی اور ہنر کو اپنے قبضے میں نہیں کیا جا سکتا یہ جنگل وسیع ہے اور گورخر یہاں بہت ہیں آؤ ہم دوبارہ کوشش کریں اور اپنی اپنی دلیری اور چابک دستی دکھلائیں۔

اسی روایت کو فردوسی نے اپنے فنکارانہ انداز میں اس طرح نظم کیا ہے،

چناں بُد کہ روزے بنخچیر گاہ — پراگندہ شد لشکر و پورِ شاہ
ہمی راند با اردوان اردشیر — جواں مرد بُد شاہ را دل پذیر
پسر بود شاہ اردوان را چہار — از آں ہر یکے چوں یکے شہریار
بھاموں پدید آمد از دور گور — از آں لشکر کشن برخاست شور
ہمہ باد پایاں برانگیختند — ہمی گرد با خوئے برآمیختند
ہمی تاخت پیش اندروں اردشیر — چو نزدیک شد در کماں راند تیر
بزد بر سرین یکے گور نر — گذر کرد بر گور پیکان و پر
بیامد ہم اندر زمان اردوان — بدید آں گشادہ بر آں جوان
بپرسید کہ ایں گور اَفگند گفت — کہ با دستِ آں کس رواں باد جفت
چنیں داد پاسخ بشاہ، اردشیر — کہ ایں گور را من فگندم بزیر

---

[1] ص ۱۳۴

پسر گفت این را من افگندہ ام ... ہماں جفت را نیز جویندہ ام
چنیں داد پاسخ بدو اردشیر ... کہ دشتی فراخ است وہم گوروتیر
یکے دیگر افگن برایں ہم نشان ... دروغ از گناہ است با سرکشان

فردوسی کے مندرجہ بالا اشعار اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ اس نے کارنامۂ اردشیر بابکان سے پورا پورا استفادہ کیا ہے اور بہت سی ایسی داستانیں نظم کی ہیں جو کارنامہ کی روایات کے عین مطابق ہیں۔ ڈاکٹر صفا نے ایسی مماثلتوں کی متعدد مثالیں دی ہیں جن کے مطالعہ سے کارنامۂ اردشیر بابکان کی اہمیت کا احساس کچھ اور زیادہ ہو جاتا ہے۔ بعض بعض مواقع پر فردوسی نے کارنامہ کی روایات سے انحراف بھی کیا ہے یعنی یا تو کارنامہ کی روایات کے کچھ اجزاء کو چھوڑ دیا ہے یا ان میں ایک آدھ باتوں کا اضافہ کر دیا ہے۔ اس فرق و اختلاف کارنامۂ اردشیر بابکان کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے جس سے فردوسی نے بہت کچھ استفادہ کیا ہے۔

پہلوی زبان کی یہ دو رزمیہ کتابیں جن میں سے ایک عہد اشکانی کی یادگار ہے اور دوسری عہد ساسانی کی، ایران کے رزمیہ ادب کے تسلسل کو ظاہر کرتی ہیں اور ان کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ ان ہی کی بنیاد پر ظہورِ اسلام کے بعد منثور و منظوم شاہنامے لکھے گئے۔ اگر یہ کتابیں محفوظ نہ رہتیں تو ظہورِ اسلام کے بعد کا رزمیہ ادب اتنا وقیع اور گرانمایہ نہ ہو پاتا۔ ڈاکٹر صفا نے ان دونوں کتابوں کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے ایران کے رزمیہ ادب کے تسلسل کو پیش کرنے کی سعیِ بلیغ کی ہے۔

۲۱ھ میں عربوں نے ایران پر حملہ کرکے وہاں کی ملوکیت کا خاتمہ کر دیا۔ اس کے بعد ایرانیوں کی ایک بہت بڑی تعداد نے اس جدید مذہب کو قبول کر لیا جو لوگ اپنے قدیم مذہب پر قائم رہنا چاہتے تھے انھوں نے جزیہ دے کر اپنے قدیم مذہب پر رہنا قبول کیا۔ وہ افراد جو نہ تو حلقہ بگوش اسلام ہونا چاہتے تھے

لہ بحوالہ سابق ۱۳۴

اور نہ ہی جزیہ دینا چاہتے تھے وہ آتش مقدس اور اپنی مذہبی کتابوں کو لے کر کسی نئے وطن کی تلاش میں نکلے نتیجتاً ہندوستان بالخصوص بمبئی اور گجرات میں آکر بس گئے یہاں آکر یہ لوگ پارسی کہلائے جو آج بھی اپنے اسی قدیم مذہب پر قائم ہیں۔ وہ گروہ جس نے ایران میں رہ کر جزیہ دینا اور اپنے مذہب پر قائم رہنا قبول کیا تھا اسی نے اپنے آبا ر و اجداد کے تمام رسوم، ان کا ادب اور تمدن محفوظ رکھا۔ ان کو اس قدر مذہبی آزادی حاصل تھی کہ تیسری صدی ہجری تک زردشتی علما ر اپنی تمام دینی کتابیں پہلوی زبان ہی میں لکھتے رہے۔ انہی لوگوں کی وجہ سے عہد اسلامی میں بھی قدیم ایرانی تمدن کی یادگاریں باقی رہیں جن میں سے اکثر آج بھی محفوظ ہیں۔ وہ گروہ جس نے اسلام کو قبول کر لیا تھا اس نے دوسرے ملکوں کے برخلاف اپنی زبان کے بیشتر اجزار کو محفوظ رکھا البتہ یہ ضرور کیا کہ حالات کے تقاضے کے تحت اس نے ایک جدید رسم الخط کو قبول کر لیا جو آج تک باقی ہے۔ عربوں سے مغلوب ہونے کے بعد اِن ایرانیوں نے ان تمام علوم و فنون میں بھی مہارت حاصل کی جو عربوں کے مخصوص علوم و فنون تھے اپنی ذہانت، طباعی اور دقیقہ رسی کی وجہ سے وہ ان علوم و فنون پر اس طرح حاوی ہوئے کہ بعض بعض علوم میں عربوں کو بھی پیچھے چھوڑ گئے۔

تمام آریوں کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ وہ اپنے حسب نسب، برتری، جواں مردی و بہادری پر نازاں اور دنیا کے دوسرے لوگوں کو اپنے سے فروتر سمجھتے رہے ہیں۔ ایرانی قوم بھی اس خصوصیت سے عاری نہ تھی۔ حلقہ بگوش اسلام ہونے کے بعد بھی ان کا احساسِ برتری اپنی جگہ برقرار رہا۔ اس احساس برتری کو بڑھاوا دینے میں خود عربوں نے مدد دی۔ تھوڑے ہی عرصہ میں دنیا کے ایک وسیع علاقے پر قابض ہو جانے کے بعد عربوں میں بھی غرور و تکبر پیدا ہو گیا۔ اسلام کی اصل روح کو بھلا کر وہ بھی ساری دنیا کو اپنے سے فروتر سمجھنے لگے۔ عربوں کی اس روش کے خلاف غیر عرب مسلمانوں میں ایک تحریک نے جنم لیا جس کو شعوبیت کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس تحریک کے اصل پشت پناہ ایرانی ہی تھے جو اپنی عرب دشمنی میں دنیا کی دوسری اقوام سے بہت آگے جا چکے تھے۔ مذہبی

نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اس تحریک کے ذریعہ افتراق بین المسلمین کی بنیاد پڑی لیکن ادبی نقطۂ نظر سے اس تحریک کا جو فائدہ ہوا اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر صفا نے نہایت واضح الفاظ میں جو کچھ لکھا ہے اس کو یہاں نقل کرنا ناگزیر ہے۔

"در تحقیر عرب و بیان مفاخر ایرانیانِ قدیم بیش از ہمہ شعوبیہ دخالت داشتند۔ شعوبیہ برائے بیانِ مرام و مقصود خود بیش از ہر کار بادب و ادبیات متوجہ شدند و از طریقِ شعر و نثر و تالیف و ترجمہ مقاصدِ خود را جامۂ عمل پوشاندند۔ مقصود اصلی ایں قوم شناساندن قوم ایرانی با ہمۂ مفاخر و مآثر او و تحریک حس میہن پرستیِ ایرانیان و سست کردن بنیاد عظمت و قدرت سیاسی و دینیِ تازیان و تحقیرِ آنان و اعادۂ استقلال و عظمت ایران بود

برائے اجرائے اجزاء ایں مقصود ایرانیان راہ ہائے در پیش گرفتند کہ از آں جملہ یکے ترجمہ و نقل کتب تاریخی و روایات و حماسیات ایرانی بزبان عرب و دیگر توسل باشعار حماسی و بیان مفاخر گذشتگان

" عربوں کی تحقیر اور قدیم ایرانیوں کے قابلِ فخر کارناموں کے بیان میں سب لوگوں سے زیادہ شعوبیہ پیش پیش تھے شعوبیہ اپنے مقصد و منتہا کو بیان کرنے کیلیے اور چیزوں سے زیادہ ادب و ادبیات کی طرف متوجہ ہوئے اور نظم و نثر، تالیف اور ترجمہ کے ذریعہ انھوں نے اپنے مقاصد کو عملی جامہ پہنایا۔ ان لوگوں (شعوبیہ) کا اصل مقصد یہ تھا کہ (عوام) قدیم ایرانیوں کے تمام آثار اور قابلِ فخر کارناموں سے واقف ہوں، ان کے اندر وطن پرستی کا جذبہ پیدا ہو اور (اس طرح) عربوں کی سیاسی اور مذہبی طاقت و قوت کمزور پڑ جائے ان کی ذلت ہو اور ایران کو دوبارہ استحکام اور عظمت حاصل ہو۔

اس مقصد کے حصول کے لیے ایرانیوں نے جو راہیں اختیار کیں ان میں سے ایک راہ یہ تھی کہ تاریخی کتابوں، روایتوں اور ایرانی رزمیوں کو عربی زبان میں ترجمہ کیا جائے اور (عربی زبان میں ہی) قدیم ایرانیوں کی عظمت و شوکت اور ان کے کارناموں کو رزمیہ اشعا

وعظمت ایشان بود۔۔۔ میں بیان کیا جائے

شعوبیت نے ایرانی شعرار کو ایک بار پھر اس کا موقع فراہم کر دیا کہ وہ اپنی ملی روایات، تاریخی واقعات اور اپنی قوم و نسل پر فخر و غرور کے جذبات کو اپنے اشعار کے ذریعہ ظاہر کریں۔ اس شکست خوردگی کے عالم میں ایرانی شعرار نے کمالِ ہوش مندی سے اپنے وسیلۂ اظہار کے لیے عربی زبان کا انتخاب کیا کیونکہ ان کو اس بات کا احساس تھا کہ اگر وہ اپنے جذبات کا اظہار فارسی زبان میں کریں گے تو عربوں کو ان کے جذبات و احساسات کا علم نہ ہو سکے گا اور ان کی شاعری کا اصل مقصد و منشا فوت ہو جائے گا اسی لیے ان ایرانی شعرار نے عربی زبان میں اتنی مہارت بہم پہنچائی کہ وہ بلا تکلف عربی زبان میں اشعار لکھنے لگے۔ ایرانی شعرار کے یہ عربی اشعار زہر میں بجھے ہوتے جن میں عربوں کی مذمت بھی ہوتی اور ایران کی قومی و ملی روایات اور گذشتہ تاریخ پر فخر و مباہات بھی۔ اس قسم کے اشعار کی وجہ سے وہ ایرانی بھی جو حلقہ بگوش اسلام ہو چکے تھے اپنی قدیم تاریخ، ملی روایات سینہ در سینہ منتقل ہونے والے قصص و حکایات سے بیگانہ نہ ہونے پائے اور انھوں نے جدید رسم الخط میں بھی ان باقیات کو محفوظ کر لینے کا اہتمام شروع کر دیا۔ ڈاکٹر صفا نے اس تحریک پر بحث کرتے ہوئے بہت سے ایرانی شعرار کے وہ عربی اشعار بھی پیش کیے ہیں جن میں ایرانیوں کی برتری، ان کی جواں مردی و بہادری کے قصے اور ان کے تمدن کی رنگا رنگی کے نغمات گائے گئے ہیں۔

اب تک جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سیاسی شکست کے باوجود ایرانیوں کا جذبۂ وطن پرستی اور اپنی قوم و نسل پر فخر و غرور کا جذبہ سرد نہیں ہونے پایا بلکہ دن بدن بڑھتا ہی رہا۔ یہاں تک کہ ایرانیوں نے عربوں کو اپنی سرزمین سے نکال باہر کیا اور اپنی قومی حکومت قائم کر لی پھر بھی اس نغمے کی لے اونچی ہی ہوتی رہی۔ جب ترکوں نے ایران پر حملہ کر کے ان کی قومی حکومت کا خاتمہ کر دیا تو یہ لے دھیرے دھیرے مدھم ہوتے

ملہ بحوالہ سابق ص ۱۴۳

ہوتے معدوم ہوگئی اور اس کی جگہ پر اسلام کی حقانیت اور اسلامی تمدن کی اہمیت کا احساس عام ہوا۔ اسی احساس کے زیر اثر مذہبی رزمیوں کا عروج ہوا جنھوں نے قومی وملی رزمیوں کی جگہ لے لی۔ ان رزمیوں پر آگے چل کر مختصر طور سے بحث کی جائے گی۔

مذکورہ بالا مفاخر پرستی کی بدولت قدیم ایران کی ایک ایک یادگار محفوظ رکھنے کی کوشش کی گئی جو تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں اپنے انتہائے کمال پر پہنچی۔ بالخصوص اہل خراسان نے قدیم یادگاروں اور آثار کو محفوظ رکھنے کے سلسلے میں بڑی قابل قدر خدمات انجام دیں۔ انہی کوششوں کے زیر اثر اس دور میں کئی منثور شاہنامے لکھے گئے جن میں قدیم ایران کی تاریخ، تہذیب، تمدن، افسانہ و روایات، اوہام و خرافات سب کو جمع کرلینے کی سعی کی گئی۔ ان منثور شاہناموں کے معرض وجود میں آنے کے بعد اسی مواد کو نظم کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش شروع ہوئی چنانچہ سب سے پہلے مسعودی مروزی نے اس کام کا بیڑا اٹھایا۔ پھر دقیقی نے گشتاسپ کی داستان نظم کرنے کا اہتمام کیا۔ ابھی وہ صرف اسی داستان کو نظم کرپایا تھا کہ اپنے ایک غلام کے ہاتھوں قتل ہوگیا۔ دقیقی کے مرنے کے بعد فردوسی نے اس کام کو اپنے ہاتھ میں لیا اور اپنی فنکارانہ مہارت، ذہانت و طباعی اور نکتہ سنجی سے مزین ایک ایسا شاہکار دنیا کے سامنے پیش کیا جس نے ایران کی قدیم تاریخ ہی کو نہیں بلکہ فردوسی کے نام کو بھی زندۂ جاوید بنا دیا۔

اوستا سے لے کر شعوبیہ کے عربی اشعار تک جو داستان پھیلی ہوئی ہے وہ ایرانیوں کی رزمیہ نگاری پر بڑی اچھی اور واضح روشنی ڈالتی ہے اس سلسلے میں جن آثار کا ذکر کیا گیا ہے ان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایران میں رزمیہ نگاری کا تسلسل ٹوٹنے نہیں پایا بلکہ ہر عہد اور ہر دور میں ایسے رزمیے لکھے جاتے رہے جو ایک دور کی روایات و قصص کو نہ صرف دوسرے دور کی روایات و قصص سے منسلک کرتے ہیں بلکہ رزمیہ نگاری کے ارتقا کے بھی شاہد عادل ہیں۔ وہ رزمیہ داستانیں جو اوستائی زبان میں لکھی گئیں کچھ ترمیم و اضافوں کے ساتھ

پہلوی زبان میں منتقل ہوئیں۔ جو رزمیہ داستانیں پہلوی زبان میں لکھی گئیں ان سے فارسی شعراء نے استفادہ کرتے ہوئے، ان بیان شدہ روایات وحکایات کی بنیاد پر نئی نئی رزمیہ داستانیں لکھیں جن میں وہ تمام روایتیں، داستانیں، قصے، کہانیاں محفوظ ہوگئیں جو اوستا اور پہلوی رزمیوں میں درج ہیں۔ اس طرح ایران کی رزمیہ نگاری صدیوں کا سفر طے کرتی ہوئی مسعودی، مروزی، دقیقی اور فردوسی کے شاہ ناموں تک پہنچی۔ یہ سلسلہ یہیں ختم نہیں ہوا بلکہ فردوسی کے شاہنامے کے زیر اثر چھٹی صدی ہجری کے اوائل تک نئے نئے انداز اور نئی نئی حکایات و روایات کے ساتھ رزمیہ داستانیں لکھی جاتی رہیں۔ فردوسی کے بعد کی تمام رزمیہ داستانوں کا ذکر باعث طوالت ہوگا اس لیے ان کے ذکر سے صرف نظر کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر صفا نے اپنی کتاب کے جس باب میں ظہور اسلام کے بعد کے ایرانی (فارسی) قومی وملی رزمیوں کا جائزہ لیا ہے اس میں انہیں ایسے رزمیوں کا بھرپور تجزیہ کرتے ہوئے ان کے مندرجات سے سیر حاصل بحث کی ہے۔ اس باب کی ابتدا مسعودی مروزی کے شاہنامہ کے مطالعہ سے ہوتی ہے جس کے صرف چند ہی اشعار ہم تک پہنچ سکے ہیں بعد ازآں شاہنامۂ دقیقی اور شاہنامۂ فردوسی کا نہایت عالمانہ مطالعہ پیش کیا گیا ہے ان تینوں شاہناموں کے مطالعے کے بعد ایسے سولہ رزمیوں پر تفصیلی نظر ڈالی گئی ہے جو ایران کے قومی وملی رزمیوں میں خاص اہمیت وحیثیت کے حامل ہیں اور سب کے سب شاہنامۂ فردوسی کے بعد لکھے گئے ہیں لیکن اپنی ندرتِ ادا کی وجہ سے اس بات کے مستحق ہیں کہ ان کا بھی تفصیلی مطالعہ کیا جائے۔

شاہنامۂ فردوسی پر ڈاکٹر صفا نے بڑی تفصیلی نظر ڈالی ہے۔ ایران میں فردوسی پر کام کرنے کا صحیح معنوں میں آغاز مرحوم سید حسن تقی زادہ نے کیا تھا۔ ان کی تحقیق اتنی دل کش اور چونکا دینے والی تھی کہ ان کے بہت سے معاصرین اور ان کے بعد کی نسل کے محققوں نے بھی اسی موضوع کو اپنے مخصوص مطالعہ کا ہدف بنایا۔ ایران کے جن چوٹی کے محققوں نے فردوسی کی حیات اور کارنامہ پر اپنے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق قابلِ قدر اور وقیع تحقیقات کی ہیں ان میں محمد علی فروغی، محمد قزوینی، ملک الشعراء بہار، عباس اقبال، مجتبیٰ مینوی، محمد علی اسلامی، ایرج افشار، محمد دبیر سیاقی

محمود شفیعی، حبیب یغمائی اور خود ڈاکٹر صفا کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔
کسی بھی محقق کے لیے ایک ایسے موضوع کے سلسلے میں جس پر بہت سے مستشرقین اور خود ایران کے چوٹی کے محققین دادِ تحقیق دے چکے ہوں، اپنے انفرادی نقطۂ نظر کو برقرار رکھتے ہوئے کوئی نئی اور جاذب توجہ بات کہنی ناممکن تو نہیں مگر دشوار ضرور ہے۔ ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا نے اس دشوار مرحلہ کو جس فنکارانہ چابک دستی اور عالمانہ دیدہ وری سے طے کیا ہے اس کی طرف چند اشارے کر دینے ضروری ہیں۔
ڈاکٹر صفا کے نزدیک ایک اچھے اور اعلیٰ درجے کی رزمیہ نظم کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ زمان و مکان کی قید سے آزاد ہو۔ ان کے نزدیک شاہنامۂ فردوسی میں یہ وصف بدرجۂ اتم موجود ہے انھوں نے اپنی بات کے سلسلے میں مثالیں دیتے ہوئے لکھا ہے کہ تور کی حکومت ایران کے شمال مشرق (ترکستان) میں واقع تھی اور سلم کی حکومت شمال مغرب (روم) میں۔ اِن دونوں علاقوں کے درمیان ایران کا پورا علاقہ پڑتا تھا مگر شاہنامہ کی رو سے یہ دونوں بادشاہ آزادانہ ایک دوسرے سے نہ صرف ربط رکھتے تھے بلکہ باہم ملاقات بھی کرتے تھے۔ اس مقام پر فردوسی نے فاصلہ مکانی کو ختم کر کے اپنی تخیل کے ذریعہ یہ دکھلایا ہے کہ وہ لوگ جن میں اتفاقِ خیال اور روحانی ارتباط ہوگا جسمانی طور پر بھی ایک دوسرے سے دور نہ رہیں گے اسی طرح شاہنامہ میں فردوسی نے بیان کیا ہے کہ رستم نے مازندران پہنچنے کے لیے جو راستہ چودہ دنوں میں طے کیا تھا اس کو دوسرے لوگ چھ ماہ میں طے کر پاتے۔ ڈاکٹر صفا کے نزدیک رستم کے اس سفر کی داستان بیان کرتے ہوئے قیدِ زمانی کو درمیان سے ہٹا دیا گیا ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر صفا نے فردوسی کے شاہنامہ سے ایک دوسری مثال دیتے ہوئے لکھا ہے کہ فردوسی کے قول کے مطابق رستم جب مازندان آیا تو اس کو کاؤس سے ملاقات کرنے کے لیے سو فرسنگ کا سفر کرنا پڑا۔ کاؤس سے ملاقات کے بعد اس کو مزید سو فرسنگ کا سفر کرنا پڑا۔ تب کہیں جا کر وہ سفید دیو سے نبرد آزما ہوا اور اس پر غالب آسکا ڈاکٹر صفا نے لکھا ہے کہ اصلاً مازندران کا عرض بیس فرسنگ اور طول سو فرسنگ سے زیادہ نہیں ہے لیکن فردوسی نے قیدِ مکانی کو ختم کر کے رستم کے سفر کی داستان کی سنگینی بڑھا دی ہے۔

اسی طرح کی مزید مثالیں دیتے ہوئے ڈاکٹر صفا نے یہ واضح کیا ہے کہ فردوسی کا شاہنامہ اگرچہ بنیادی طور پر صحیح تاریخی واقعات اور روایات پر مبنی ہے مگر ایک اعلیٰ رزمیہ کی طرح اس میں قید زمان و مکان کی پابندی نہیں کی گئی ہے۔

ڈاکٹر صفا نے اپنے مخصوص نقطۂ نظر سے شاہ نامۂ فردوسی کا مطالعہ کرتے ہوئے ان عورتوں کے کرداروں پر بھی قدرے مختصر مگر جامع بحث کی ہے جن کا ذکر جابجا شاہنامۂ فردوسی میں آیا ہے۔ فردوسی نے ایرانی اور تورانی دونوں ملکوں کی عورتوں کی تصویرکشی کی ہے یہ عورتیں جانباز، دلیر، جنگجو، آن پر مرمٹنے والی ہونے کے ساتھ ساتھ حسن صورت کا بھی شاہکار ہیں۔ ان میں سے بعض بعض ایسی بھی عورتیں ہیں جو نہ صرف مردوں سے نبرد آزما ہوئیں بلکہ ان پر غالب بھی آئیں۔ ان عورتوں کے کردار سے بحث کرتے ہوئے ڈاکٹر صفا کے جریرہ، تہمینہ، بانوگشسپ، گرد آفرید، کردیہ اور شیرین کے کرداروں کو فردوسی کے اشعار کے ذریعہ ابھارنے کی کوشش کی ہے یہ عجیب بات ہے کہ عورتوں کی اس مردانگی اور جنگ جوئی کے باوجود بھی اس زمانے کے معاشرے میں عورتوں کو صنف ضعیف ہی سمجھا جاتا تھا چنانچہ فردوسی نے اکثر جگہوں پر ان عورتوں کی رایوں میں عدم استحکام کی طرف بہت واضح اشارے کیے ہیں۔ چونکہ ڈاکٹر صفا کی نظر قدیم ایران کے تمدن پر بڑی گہری ہے اور وہ کسی بھی ادب پارہ کا مطالعہ کرتے وقت اس کو اس کے زمانۂ تصنیف کے تمدن سے الگ کرکے دیکھنے کے عادی نہیں ہیں اسی لیے انھوں نے عورتوں کی کمزوری اور ان کی زبوں حالی کی طرف اشارے کیے ہیں جو اس زمانے کے تمدن پر نظر رکھنے والا ہی کوئی محقق کرسکتا تھا، ڈاکٹر صفا نے اس ضمن میں لکھا ہے:

" اما چوں ازیں گروہ و چند تن دیگر بگذریم موجودی ضعیف وسست رایست۔ پہلوانان و شاہان رعایتِ حالِ زناں را مانند ہمہ ضعیفان واجب و

لیکن جب ہم اس قبیل اور چند دوسری (خواتین) سے صرف نظر کرلیں تو بقیہ تمام عورتیں کمزور اور سست رائے ہیں۔ بادشاہ اور پہلوان دوسرے عام کمزوروں کی طرح عورتوں کا خیال رکھنا ضروری سمجھتے ہیں

ضروری می شمردند۔ نصائح زنان
نزد پہلوانان ارج و بہائی ندارد۔
اسفندیار در پاسخ پندہائے مادر
چنیں گفت :

کہ پیش زنان راز ہرگز مگوی
چو گوئی سخن بازیابی بکوی
اگر لب ببندی ز بہر گزند
نگوئی زنان را، بود سودمند
بکارے مکن نیتر فرمانِ زن
کہ ہرگز نہ بینی زنی رایزن

بیژن از کشادنِ رازِ رستم
(کہ بزی بازرگانان بہ توران رفتہ بود) نزد
منیژہ سرباز زد ولی چوں ایں زن
فداکار و وفادار سوگند یاد کرد، رازِ خویش
را بہ او درمیان نہاد۔

زنان در شاہنامہ از پوشیدگانند و
ازمیان ایشاں چنانکہ دیدہ ایم برخی مانند
گردآفرید و کردیہ زنانی دلیر و
جنگجویند۔ سودابہ زنےست زیبا
و در عشق لجوج و پایدار۔
ولی خبثی در نہاد خویش دارد
و آخر بر سر ایں خبث سیاوش
را از میان می برد
و خود نیز تباہ می شود و ایران
و توران را بہم می انگند۔

عورتوں کی نصیحتیں پہلوانوں کے لیے
کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتیں۔
اسفندیار نے اپنی ماں کی نصیحتوں کے جواب
میں اس طرح کی باتیں کیں عورتوں کے سامنے

راز کی باتیں ہرگز نہ کہو
جب تم ان سے (راز) کہو گے تو اسکو گلی کوچوں میں پاؤگے
اگر تم نقصان پہنچنے کے خوف سے اپنے ہونٹ بند کرتے ہو
(تو) عورتوں سے مت کہو (کیونکہ یہی بات) مفید ہوگی
کوئی بھی کام عورت کے فرمان کے مطابق مت کرو
کیونکہ تم کسی بھی عورت کو صائب الرائے نہ پاؤگے

بیژن نے رستم (جو کہ سوداگر کے بھیس میں
توران گیا تھا) کے راز کو منیژہ سے چھپایا
لیکن جب اس باوفا اور فداکار عورت
نے قسم دی تو اس نے اپنا یہ راز اس پر
ظاہر کیا۔

شاہنامہ میں عورتیں پردہ پوش ہیں اور
جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے ان میں سے چند
مثلاً گردآفرید اور کردیہ بہادر اور جنگجو
عورتیں ہیں۔ سودابہ ایک خوبصورت
عورت ہے اور اپنے عشق میں راسخ بھی۔
لیکن اپنی طینت میں خبث بھی رکھتی ہے
اور اسی خبث کی وجہ سے وہ سیاوش
کو درمیان سے ہٹا دیتی ہے (جس کی
وجہ سے) خود بھی تباہ ہوتی ہے اور ایران
و توران بھی ایک دوسرے سے برسرِپیکار

زنان دیگر نیز ہر یک خصایصی دارند کہ بالاتر از ہمہ آنہا رافت و وفا و عواطف عالیۂ انسانی و مادریست[1]"	ہوتے ہیں۔ (شاہنامہ) کی دوسری عورتیں بھی مخصوص خصائص کی حامل ہیں ان کی سب سے اہم خصوصیت مہربانی، وفا اور انسانی و مادرانہ بلند احساسات ہیں۔

ڈاکٹر صفا نے شاہ نامۂ فردوسی کی اس خصوصیت پر جو کچھ لکھا ہے وہ اگرچہ مختصر ہے مگر اسی اختصار میں وہ تمام باتیں آگئی ہیں جو ان کے افکار و نظریات کو سمجھنے کے لیے کافی ہیں۔

ڈاکٹر صفا نے شاہ نامہ کے خصائص پر بحث کرتے ہوئے ان عشقیہ داستانوں پر بھی بڑی غائر نظر ڈالی ہے جو شاہنامہ میں جگہ جگہ پر نظم ہوئی ہیں اور جن کی وجہ سے اس رزمیہ کو پڑھتے وقت قاری کسی تکدر کا شکار نہیں ہونے پاتا بلکہ رزمیہ سے اس کی دلچسپی برقرار رہتی ہے ڈاکٹر صفدر کے نزدیک رزمیوں میں داستانِ عشق کا بیان ہونا صرف ایرانی رزمیوں کی خصوصیت نہیں ہے بلکہ عالمی ادب کے جو بھی عظیم رزمیے ہیں ان سب میں کوئی نہ کوئی داستانِ عشق دیکھی جا سکتی ہے۔ مثال کے طور پر انھوں نے ایلیڈ، آڈیسی، بیو دلف کی رزمیہ نظم اور رامائن کے نام لیے ہیں جن میں جنگجوئی و قتال کی داستانوں کے ساتھ ساتھ عشقیہ داستانیں بھی نظم کی گئی ہیں۔ ڈاکٹر صفا کے نزدیک اس طرح کی داستانیں رزمیوں میں صرف اس لیے نظم کی جاتی ہیں کہ قاری کو پکڑ دھکڑ، شور و غوغا اور کشت و خون کے ماحول میں بھی سکونِ روح حاصل ہو سکے لیکن اسی کے ساتھ ساتھ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ شاہنامہ میں جو عشقیہ داستانیں نظم ہوئی ہیں ان کو مذکورہ بالا رزمیوں کی عشقیہ داستانوں سے الگ کر کے دیکھنا چاہیے۔ شاہنامہ فردوسی کی عشقیہ داستانوں کی اہمیت ڈاکٹر صفا کے الفاظ میں یہ ہے:

در داستانِ زال و رودابہ نزاع عظیمی میان عشق و پرستش	زال اور رودابہ کی داستان میں ایران کی شاہی نسلوں کی پرستش، ان کے دشمنوں

---

[1] بحوالۂ سابق ص ۲۴۴

نژاد شاہان ایران دشمن داشتن
خصمان آنان پدیدار است و ہمیں
صراع مایۂ تطویل داستان
و افزودن دردِ زال و رودابہ
و گرفتار ساختن بفراقی ناپائدار
است۔ امّا ایں عشق و ہم چنیں
عشق بیژن بہ منیژہ و دخترِ طائرِ عرب بہ شاپور
و گلنار با اردشیر بسودِ ایران
ختام پذیرفت و مایۂ پدید آمدن پہلوانان
و یا فتوحِ تازہ در برابر دشمنان یا ظہور
پادشاہی بزرگ گشت و ازیں روی می بینیم کہ
وحدت نظر شاہنامہ یعنی بیان
مفاخر ایران در ایں داستانہا
محفوظ ماند چنان کہ آنہا را می تواں
بحقیقت دنبالہ و جزء داستانہای پہلوانی
دیگر دانست۔ داستان رودابہ و زال
در شاہنامہ مقدمۂ ظہور رستم و داستان جنگہائے
بے نظیر اوست، داستانِ منیژہ و بیژن
نیز بچارہ گری و تدبیر و پہلوانی
نمودن رستم ختام می پذیرد۔
عشق تہمینہ بہ رستم مقدمۂ تولدِ سہراب
و پدید آمدن یکے از بزرگ ترین
داستانہائے پہلوانی و غم انگیز
شاہنامہ است پس داستانہای عشقی شاہنامہ
را خاصہ در قسمت پہلوانی ایں کتاب

سے دشمنی اور محبت کے درمیان زبردست
کشاکش و کشمکش ظاہر ہوتی ہے اور یہی
کشاکش و کشمکش اس داستان کو طویل بناتی ہے
زال اور رودابہ کے دکھ درد کو بھی بڑھاتی ہے
اور ان کو ایک ناپائدار جدائی میں بھی گرفتار
کر دیتی ہے لیکن یہ عشق اور اسی طرح منیژہ
اور بیژن، طائرِ عرب کی لڑکی اور شاپور،
گلنار اور اردشیر کے عشق ایران کی بھلائی
پہلوانوں کے ظہور، دشمنوں پر نئی فتح یا
زبردست حکومت کی بنیاد پڑنے پر اختتام پذیر
ہوتے ہیں۔ اور اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ
شاہنامہ کی وحدتِ نظر یعنی ایرانیوں کے
قابلِ فخر کارناموں کا بیان ان داستانوں
میں محفوظ ہے۔ دراصل ان (عشقیہ) داستانوں
کو دوسری رزمیہ داستانوں کا جزو اور تسلسل
سمجھنا چاہیئے۔ زال اور رودابہ کی داستان
رستم کے ظہور اور اس کی بے بدل جنگوں کا
پیش خیمہ ہے۔ بیژن اور منیژہ کی داستان
رستم کی چارہ گری، تدبیر اور بہادری کا
مظاہرہ کرنے پر اختتام پذیر ہوتی ہے
تہمینہ اور رستم کے عشق کی داستان سہراب
کی پیدائش اور شاہنامہ کی ایک اہم ترین
غم انگیز رزمیہ داستان کے ظہور کا پیش
خیمہ ہے اس لیے شاہنامہ کی عشقیہ داستانوں
کو خاص طور سے اس کتاب کی رزمیہ

نمی توان از داستانہائے پہلوانی و حماسی جدا شمرد و اصولاً باید دانست کہ در ایں عاشقی ہا زبونی و شیفتگی عشاق کہ بہ ضعف تن و پریشانی فکر و خفت عقل کشد وجود ندارد و پہلوانانِ عاشق تا آخر بن نفس سجایائے پہلوانی و مردانگی خود را نگاہ می دارند[1]"

داستانوں سے جدا شمار نہیں کیا جا سکتا۔ اصولی طور پر اس سلسلے میں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ان عشقیہ داستانوں میں عاشقوں کی وہ فریفتگی اور زبونی جوان کے جسم کو کمزور، خیال کو پراگندہ اور عقل کو شرمندہ کردے وجود نہیں رکھتی بلکہ ان داستانوں کے عاشق اور پہلوان اپنی زندگی کی آخری سانسوں تک اپنی مردانگی اور پہلوانی کی خصوصیات کی حفاظت کرتے ہیں۔

فردوسی کے شاہ نامہ میں بادشاہوں کی جن عشقیہ داستانوں کو نظم کیا گیا ہے ڈاکٹر صفا کے نزدیک ان میں بیان شدہ عشق اصلی و حقیقی نہیں بلکہ رسمی اور سیاسی ہے انھوں نے اس سلسلے میں متعدد مثالیں دیتے ہوئے اپنی بات کی وضاحت بھی کردی ہے۔ اسی سلسلہ سخن میں ڈاکٹر صفا نے اس بات کی بھی صراحت کردی ہے کہ شاہ نامہ میں جن ہیروؤں کی داستان عشق نظم کی گئی ہے ان کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ بہادر و جواں مرد افراد عشق کے چکر میں پڑ کر اپنے دینی مسلک سے بال برابر بھی منحرف نہیں ہوتے تھے اس سلسلہ میں ڈاکٹر صفا نے رستم اور تہمینہ کی داستانِ عشق کی مثال دیتے ہوئے لکھا ہے کہ تہمینہ رستم پر جی جان سے فدا ہوئی وہ بہت ہی خوبرو اور دل کش عورت تھی۔ رستم نے جب اس کی حد سے بڑھی ہوئی شیفتگی دیکھی تو اس کو اپنانے پر آمادہ ہوگیا لیکن تہمینہ کو حاصل کرنے کے لیے اس نے کوئی دنیاوی طریقہ نہیں اپنایا بلکہ اپنے دین کے مطابق اس نے ایک موبد کو بلوا کر تہمینہ سے نکاح کیا پھر کہیں جا کر اس سے متمتع ہوا۔ فردوسی کے شاہنامہ پر اب تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور آئندہ بھی بہت کچھ لکھا جائے گا۔

---

[1] بحوالہ سابق ص ۲۴۵

مگر ڈاکٹر صفا نے فردوسی کے شاہنامہ پر بحث کرتے ہوئے اس کے جن مذکورہ خصائص کو ابھارا ہے اس میں وہ منفرد و یگانہ ہیں۔ ممکن ہے کہ ان کے بعد کے محققین اس موضوع پر مزید تحقیق کر کے نئے نئے نکات پیدا کریں مگر اس وقت تک ڈاکٹر صفا اپنے اس وصف میں ممتاز و یگانہ ہیں۔

جن اسباب کی بنا پر ایران میں رزمیہ نگاری روبہ زوال ہو کر رفتہ رفتہ معدوم ہو گئی ان پر ڈاکٹر صفا نے اپنے نقطۂ نظر سے سیر حاصل بحث کی ہے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے جو اسباب بیان فرمائے ہیں اور ان سے جو نتائج اخذ کیے ہیں وہ ہمارے نزدیک محلِ نظر ہیں اسی لیے یہاں پر ان کے بیان کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے تاکہ اس پر تنقیدی نظر ڈالنے میں آسانی ہو۔

چوتھی صدی ہجری کے اواخر میں جب اُن آزاد شدہ ترک غلاموں اور حملہ آور ترک نژاد قبائل نے ایران پر قبضہ کیا جن کا "ذاتی تعصب، خشکی اور سادہ لوحی" مشہورِ زمانہ ہے تو ایران کی حالت بدتر ہو گئی۔ عربوں کے تسلط اور غلبہ سے ایران اور ایرانیوں کو وہ نقصان نہیں ہوا جو ترکوں کے دورِ اقتدار سے ہوا۔ عربوں کی ہر وہ ضرب جو ناتمام، بے اثر اور بے ثمر ثابت ہوتی رہی تھی ترکوں کے عہدِ اقتدار میں نہ صرف وہ مکمل با اثر اور بارآور ہوئی بلکہ ایران کی سیاسی اور اجتماعی زندگی میں پوری طرح سرایت بھی کر گئی۔ ڈاکٹر صفا کے الفاظ میں ترکوں کے "اقتدار سے ایران کو جب سب سے بڑا نقصان پہنچا وہ یہ تھا:

"خطرناک ترین ارمغانی کہ غلامانِ ترک یا قبائل مہاجم ترک نژاد برائے ایرانیان آوردند تعصب مذہبی و اعتقاد شدید کورکورانہ وگاہ ابلہانہ بہ بیست بخرافات و مبلغان و ناشران ایں خرافات کہ اغلب بہ تدریج صورت احکام و مسائل دینی یافتہ و در اعماقِ ذہنِ ایرانیان رخنہ کردہ است[1]"

ترک غلام یا حملہ آور ترک قبیلے ایرانیوں کے لیے جو خطرناک ترین تحفہ لائے وہ مذہبی تعصبات، کورانہ معتقدات جو کبھی کبھی احمقانہ خرافات بھی ہوتے تھے۔ اور ان خرافات کی تبلیغ کرنے اور پھیلانے والے لوگوں سے [illegible] ایسے بیشتر خیالات نے دھیرے دھیرے دینی احکام اور مسائل کی شکل پا کر ایرانیوں کے ذہن کی گہرائی میں دراڑ ڈال دی ہے۔

---

[1] بحوالہ سابق، ص ۱۵۵

ظہورِ اسلام کے بعد بھی چوتھی صدی ہجری تک ایرانیوں نے جو کچھ بھی قومی و ملی خدمات انجام دی تھیں ترکوں کے غلبہ و اقتدار کی وجہ سے وہ سب کی سب نقش برآب ہونے لگیں۔ بوسلم، مقنع، بابک اور مازیار جیسے ایرانی "پاک نفوس" نے احیائے ملت اور استحکام قوم کے لیے اپنا جو خون بہایا تھا وہ سب کا سب ضائع ہونے لگا۔ یعقوب اور مرداویز کی نبرد آزمائیاں، فردوسی کی شب بیداریاں، ابن المقفع اور اس کے ساتھیوں کی جانفشانیاں، برمکیوں، آلِ سہل اور دوسرے "آزاد مردوں" کی تمام تدبیریں عتر بود ہونے لگیں جس کی وجہ سے دھیرے دھیرے ایرانی قوم اپنے قومی و ملی فخر و مباہات سے رفتہ رفتہ دست بردار ہونے لگی نوبت یہاں تک پہنچی کہ چنگیز، ہلاکو اور تیمور جیسے سفاک قاتل، جن سے آدمیت چھو کر بھی نہیں گزری تھی خدا کے برگزیدہ بندے اور ایران کے مالک و آقا سمجھے جانے لگے۔ انہی اثرات کی بنا پر اس زمانے میں ایرانیوں نے اپنے آباد اجداد تک کو "ناپاک اور نادان" سمجھنا شروع کر دیا کیونکہ وہ دینِ مجوسی کے پیرو تھے۔ تیسری اور چوتھی صدی ہجری کے بعد سے ہم جتنا بھی آگے بڑھتے جائیں گے ہم کو یہ لے تیز سے تیز تر ہوتی ہوئی ملے گی اور ہم دیکھیں گے کہ قومیت و ملیت کے مفہوم و معنی ہی کو ایرانیوں نے فراموش کر دیا ہے

چھٹی صدی ہجری اور اس کے بعد کی صدیوں میں اسلامی افکار کے شدید و عمیق نفوذ اور قومی و ملی فکر کے ضعف و انحطاط مزید برآں نسلی تعصب کی وجہ سے ایرانیوں کے ذہن و دماغ سے قومی و ملی افکار محو ہونے لگے اور ان کی جگہ تاریخی اور مذہبی فکر نے لے لی۔ اسی لیے ہم دیکھیں گے کہ چھٹی صدی ہجری کے بعد ایران میں جو رزمیہ نظمیں لکھی گئی ہیں وہ یا تو تاریخی رزمیہ منظومات ہیں یا مذہبی رزمیہ منظومات۔ اس زمانے کے بعد پھر کوئی قابلِ ذکر قومی و ملی رزمیہ نظم نہیں لکھی جا سکی۔ ان اسباب کے علاوہ مندرجہ ذیل اسباب کی بھی بنا پر قومی و ملی رزمیہ منظومات زوال پذیر ہوئیں۔

۱۔ تمدن کے ارتقا کے ساتھ ساتھ شعر و ادب کے اسالیب میں بھی تبدیلیاں ہونے لگتی ہیں اور نئے نئے اسالیب، جدید افکار و خیالات، اور گوناگوں موضوعات کا اضافہ بھی ہوتا رہتا ہے جس کے نتیجے میں دھیرے دھیرے اساطیری قصے کہانیوں، جنگ و جدل کی داستانوں اور جدال و قتال کی منظر کشی سے انسانی طبیعتیں ابا کرنے لگتی ہیں۔ وہی چیزیں جو کل تک ان کے لیے دلکش اور جاذب

حر ہیں اب لایعنی اور بے سر و پا معلوم ہونے لگتی ہیں ایرانی تمدن کے ارتقا کے ساتھ ساتھ فارسی ادبیات میں بھی یہی کچھ ہوا۔ ایران میں پانچویں صدی ہجری ہی سے لوگوں کی طبیعتیں مذکورہ بالا موضوعات سے سیر ہونے لگیں، جنگ و جدل، قتال و خونریزی اور مافوق الفطرت اشیاء کی سحر انگیزیوں میں پہلی سی رنگینی و رعنائی کا فقدان نظر آنے لگا۔ اس صورتِ حال کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس عہد میں جو رزمیہ داستانیں لکھی بھی گئیں وہ جوشِ بیان سے عاری اور مصنوعی جذبات کا ایک مرقع بن کر رہ گئیں۔ چھٹی صدی ہجری کے بعد تو دو تین ہی رزمیہ منظومات لکھی گئیں جو اپنی ادبی قدر و قیمت کے لحاظ سے تیسرے اور چوتھے درجے کی تخلیقات میں شمار کی جانے کی مستحق ہیں۔

۲۔ شعوبی تحریک کی گونج اور قومی و ملی حکومت کی موجودگی کی بنا پر پانچویں صدی ہجری تک شاعروں کے دلوں میں قومی مفاخرت اور نسلی برتری کے جذبات موجزن تھے۔ انہی جذبات کی بنا پر وہ رزمیے عالمِ وجود میں آئے جو ادبیاتِ ایران کا قابلِ فخر سرمایہ ہیں لیکن ترکوں کے غلبہ کے بعد مذکورہ جذبات کی جگہ" مذہبی تعصب نے لے لی اور قومی مفاخرت و نسلی برتری کے جذبات کا نام و نشان بھی باقی نہ رہ گیا۔ عربوں اور ایرانیوں کے درمیان دوری کی جو دیوار کھڑی تھی وہ مذہبی جذبات کے ہاتھوں ڈھے گئی۔ اسی لیے اس "تاریک دور میں ایرانیوں کی زندگی، تمدن اور معاملات کے لیے نمونۂ اتباع ان کے ایرانی آبا و اجداد نہیں بلکہ اہلِ عرب سمجھے جانے لگے جس کی بنا پر ایرانی روایات و حکایات اور قصے کہانیوں کی جگہ عربی روایات اور قصے کہانیوں نے لے لی اور کسی فرد واحد میں بھی اس بات کا جذبہ باقی نہیں رہا کہ وہ قدیم ایرانی روایات و حکایات یا قصے کہانیوں کو نظم کرے۔

۳۔ "تربیت سے عاری اور نسلی افتخار سے محروم" مزید برآں "جبر و زور و تشدد" پر انحصار رکھنے والے ترک تبار نژاد غلاموں کے ایران پر تسلط کے بعد سے ایران میں مردم کشی، غارت گری اور لوٹ کھسوٹ کا دور دورہ ہوا۔ غزنویوں اور سلجوقیوں کے کچھ عرصۂ حکومت کو چھوڑ کر ایران صرف قتل و غارت گری، خوف و دہشت اور دار و گیر کا شکار رہا دریائے جیحون کے اس پار رہنے والے ترک نژاد قبائل اور نو آزاد شدہ ترک غلاموں کے نفوذ کے اثرات چنگیزی بلاؤں مغولی مطلق العنانی

کی چیرہ دستیوں، تیمور کی خونریزیوں، اخلاف تیمور کے باہمی جدال و قتال، صفوی بادشاہوں کی مذہبی سیاست اور افغانوں کی لوٹ مار کی شکل میں ظاہر ہوتے۔ ان پیا پے حادثات کی وجہ سے ایرانی قوم اپنے روشن ماضی کو فراموش کرتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ اس کی مادری زبان بھی انحطاط کی طرف مائل ہو گئی۔ ظاہر ہے کہ ایسے گیرودار اور کشت و خونریزی کے ماحول میں نسلی برتری پر فخر و مباہات کرنا اور قدیم زمانے کی رزمیہ داستانوں کو نظم کرنا کس طرح ممکن تھا؟ اسی وجہ سے ایران میں چھٹی صدی ہجری کی ابتدا ہی سے رزمیہ نگاری حرفِ غلط کی طرح مٹ کر رہ گئی۔ ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری میں جو دو ایک رزمیہ نظمیں عالمِ وجود میں آئیں وہ اپنی ادبی حیثیت کے لحاظ سے قابلِ ذکر بھی نہیں ہیں۔

۴۔ ایران میں عربوں کے نفوذ، ترکوں کے تسلط اور ان کی مسلسل قتل و غارت گری کے ساتھ ہی ساتھ مختلف قوموں (عربی، ترکی اور ایرانی) کا ایک عجیب و غریب اختلاط بھی پیدا ہوا۔ اس اختلاطِ قوم و نسل اور اسلامی تعلیمات کی وجہ سے ایرانی قوم اپنے آبا و اجداد اور ان کے کارناموں پر فخر و غرور کرنے سے منحرف ہونے لگی، کیونکہ ان کا یہ فعل اسلامی تعلیمات سے میل نہ کھاتا تھا۔ خود ترکوں کا مفاد بھی اسی بات میں مضمر تھا کہ ایرانی اپنے آبا و اجداد پر فخر کرنے کے بجائے اپنے مذہب اور مذہبی بزرگوں پر فخر کریں۔ اس طرح سے ایرانیوں کا احساسِ قومیت و ملیت فنا ہو کر رہ جائے گا اور جب یہ احساس ہی باقی نہ رہے گا تو قومی و ملی رزمیہ نگاری جو احساسِ قومیت و ملیت ہی کا ایک پرتو ہے کہاں باقی رہ سکے گی۔

۵۔ چوتھی اور پانچویں صدی ہجری میں جدال و قتال جواں مردی و بہادری کے موضوعات پر رزمیہ نظمیں لکھنے پر کافی توجہ مبذول رکھی گئی اور فارسی رزمیہ ادب کا تقریباً پورا کا پورا حصہ اسی عہد میں نظم ہوا، اور ایسی ایسی عظیم رزمیہ نظمیں لکھی گئیں۔ جنھوں نے تقریباً تمام ایرانی داستانوں، حکایتوں، روایتوں اور قصے کہانیوں کا احاطہ کر لیا۔ صرف تھوڑی سی ایسی داستانیں اور قصے کہانیاں باقی بچیں جو نظم نہ کی جا سکیں۔ ان بقیہ داستانوں میں سے کچھ کو ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری میں نظم کیا گیا، جو داستانیں اب بھی نظم ہونے سے رہ گئیں ان کو رفتہ رفتہ

فراموش کر دیا گیا۔

۶۔ مذہب اسلام کے نفوذ اور عربی "آئین، آداب اور عادات" کو اختیار کر لینے کی وجہ سے ایرانیوں کے دلوں میں مذہبی بزرگوں اور ہیروؤں نے وہ جگہ حاصل کر لی جو پہلے صرف قومی و ملی ہیروؤں کے لیے مخصوص تھی۔ اسی لیے شاعروں نے بجائے اس کے کہ وہ اپنے قومی ہیروؤں کو اپنی شاعری کا موضوع بناتے انھوں نے تاریخی واقعات یا مذہبی بزرگوں کی شخصیتوں کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ ان منظومات کو بھی اسی بحر یعنی بحرِ متقارب میں نظم کیا گیا ہے مگر ان منظومات میں وہ رنگینی، دل کشی، رعنائی اور زیبائی نہیں ہے جو قومی و ملی کا خاصہ ہے۔

۷۔ جب ان "خود پسند اور نو عروج" ترکوں کا دور آیا تو انھوں نے اپنی عظمت و بزرگی کے اظہار کا سب سے بڑا اور مفید ذریعہ شعر و شاعری کو سمجھا چنانچہ وہ شعرا کو اپنی مدح میں قصیدے لکھنے اور ایسی مثنویاں منظوم کرنے پر اکساتے اور رغبت دلاتے رہے جن میں ان کی جنگجوئی، دلیری، استقامت و بہادری کی تصویر کشی کی گئی ہو۔ اس "ناہنجار وضع" کی ابتدا محمود غزنوی کے زمانے سے بڑے شدت کے ساتھ ہوئی اور رفتہ رفتہ یہی "وضعِ ناہنجار" ادبیات ایران کا سکۂ رائج الوقت بن گئی۔ جب منگولوں اور تیموریوں نے اپنی "تیغِ بے دریغ" کے ذریعہ ایران پر قبضہ کیا اس زمانے میں بھی اس ناہنجار طریقہ کو بڑھاوا ملتا رہا چنانچہ منگولوں اور تیموریوں کے عہد میں بہت سے ظفر نامے اور شاہ نامے منگولی اور تیموری بادشاہوں کی مدح میں لکھے گئے۔ اس بات کا نتیجہ یہ ہوا کہ چھٹی صدی ہجری سے لے کر آج تک بحرِ متقارب میں رزمیہ شکل کی صرف وہی نظمیں لکھی جاتی ہیں جو بادشاہوں کی مدح میں ہوتی ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ اسی بحر اور اسی شکل میں چھوٹے چھوٹے ناقابلِ اعتنا امرا تک کی مدحیں لکھی گئی ہیں۔ اس سے بھی عجیب تر لطیفہ یہ رو نما ہوا ہے کہ بعض شعرا نے اسی بحر میں رزمیہ شکل و صورت کی نظمیں یوروپین ممالک کے بادشاہوں کی مدح میں بھی لکھی ہیں۔

اِن نکات سے ڈاکٹر صفا نے جو نتیجہ اخذ کیا ہے وہ ان ہی کے الفاظ میں درجِ ذیل ہے۔

"از مطالعۂ این مقدمات ہفت گانہ میتوان خلاصہ ای بنحو ذیل ترتیب داد:
در قرن چہارم و پنجم قسمت اعظم داستان ہائے حماسی ایرانیان بنظم فارسی درآمد و تنہا چند داستان برجائے ماند کہ بعضی از آنہا بعد از قرنِ ششم منظوم شد و دیگر از داستانہائے ملی ایران چیزے بنظم در نیامد امّا در قبالِ انحطاط و فنائے حماسۂ ملّی دو نوع تازہ از حماسہ در ایران معمول و متداول شد یکے حماسہ ہائے تاریخی یعنی منظومہ ہائے حماسی کہ در باب رجالِ تاریخی ترتیب یافت و نخستین آنہا سکندر نامۂ نظامی است و آخری آنہا شہنشاہ نامۂ صبا۔ دیگر حماسہ ہائے دینی یعنی منظومہ ہائے کہ در باب سرگذشت تاریخی یا داستانی رجال و پہلوانان دینِ اسلام ساختہ و پرداختہ شدہ مانند خاور نامہ (یا خاوران نامہ) و صاحبقران نامہ و خداوند نامہ و حملۂ حیدری و نظائرِ اینہا[1]"

ان سات نکات کے مطالعے سے مندرجہ ذیل خلاصہ مرتب کیا جا سکتا ہے۔

چوتھی اور پانچویں صدی میں ایرانیوں کی رزمیہ منظومات کا ایک بڑا حصہ فارسی اشعار میں منتقل ہوا۔ صرف کچھ داستانیں باقی رہ گئیں جن میں سے بعض چھٹی صدی کے بعد نظم کی گئیں۔ ان کے علاوہ ایران کی دوسری ملی داستانوں میں سے کوئی داستان (فارسی میں) نظم نہیں ہوئی لیکن ملی رزمیہ کے انحطاط اور زوال کے زمانے میں دو نئی قسم کی رزمیہ نگاری ایران میں رائج ہوئی پہلی قسم کی رزمیہ داستانیں تاریخی ہیں جو تاریخی شخصیات کے سلسلے میں نظم ہوئیں اس قسم کی رزمیہ داستانوں میں نظامی کے سکندر نامے کو اولیت حاصل ہے اور صبا کا شہنشاہ نامہ اس سلسلے کی آخری کڑی ہے۔ دوسری قسم کی رزمیہ داستانیں مذہبی ہیں۔ یہ داستانیں مذہبِ اسلام کی تاریخی سرگذشتوں یا افسانوی اور پہلوانی شخصیتوں پر لکھی گئی ہیں۔ ایسی رزمیہ داستانوں میں خاور نامہ (یا خاوران نامہ) صاحبقران نامہ، خداوند نامہ، حملۂ حیدری اور اسی قبیل کی دوسری منظومات ہیں۔

ڈاکٹر صفا نے قومی و ملی و رزمیہ نگاری کے زوال کے جو سات اسباب گنوائے ہیں

---

[1] حماسہ سرائی در ایران ص ۱۵۸ - ۱۵۹

ان میں سے پہلا سبب، سب سے زیادہ اہم اور دل کو لگنے والا ہے اس کے بعد کے بقیہ چھ اسباب ایک ہی موضوع کی مختلف شاخیں ہیں اور یہ تمام کے تمام اسباب ترکوں کے ورودِ ایران اور ان کے طویل دورِ حکومت کے کوائف و حوادث سے کسی نہ کسی پہلو سے تعلق رکھتے ہیں اسی لیے ہم ان اسباب کو ایک سبب قرار دیتے ہوئے اس کا جائزہ لینے کی کوشش کرتے ہیں۔

قبل اس کے کہ یہ جائزہ شروع کیا جائے بہتر معلوم ہوتا ہے کہ اس باب کے اندازِ نگارش کی طرف بھی ایک اشارہ کر دیا جائے۔ اس پوری کتاب میں ڈاکٹر صفا کا قلم جادۂ اعتدال سے ہٹتا محسوس نہیں ہوتا لیکن جب صاحب موصوف اس باب پر پہنچتے ہیں تو ان کے قلم سے ایسے ایسے جملے اور فقرے نکل جاتے ہیں جو ان کے جیسے سنجیدہ، متین، دیدہ ور اور باوقار محقق کے شایانِ شان نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر اس باب میں ڈاکٹر صفا کے قلم سے یہ تراکیب رقم ہوئی ہیں۔ ترکوں کے لیے "دستِ ناپاکِ ایں قوم" (ص ۱۵۴) چنگیز، ہلاکو اور تیمور کے لیے "مشامِ ناپاکِ شان" (ص ۱۵۵) ترکوں کے لیے "مردمی عاری از تربیت و فارغ از افتخارات" (ص ۱۵۷)، "متکی بزور و مردم کشی و غارت گری و چپاول" (ص ایضاً)، "نو خاستگانِ خود پسند ترک" (ص ۱۵۸) وغیرہ۔ اگر صاحبِ موصوف ان تراکیب کا استعمال نہ کرتے تب بھی ان کے فرمودات کا وزن و وقار برقرار رہتا، ان تراکیب کی موجودگی نے ان کی تحریر کے وزن و وقار میں کوئی اضافہ تو نہیں کیا ہے البتہ مجروح کر کے ضرور رکھ دیا ہے۔ تعجب خیز یہ ہے کہ ایران کے قدیم تمدن، مذہب اور رسم الخط کو جو بھی زوال ہوا وہ عربوں کے ہاتھوں ہوا لیکن عربوں کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر صفا کے اندازِ بیان میں وہ تلخی و تندی نہیں پائی جاتی جو ترکوں کا تذکرہ کرتے وقت ہر ہر سطر میں نمایاں ہے۔ اسی تلخی و تندی کی وجہ سے ان کے دلائل بعض اوقات بے وزن ہو کر رہ گئے ہیں۔

ظہورِ اسلام کے بعد لیکن ترکوں کی آمد سے بہت پہلے ایرانیوں کی جو ذہنی حالت ہو گئی تھی اگر اس کو مدِ نظر رکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ فاتح عربوں سے مفتوح ایرانی زندگی کے ہر ہر موڑ اور مقام پر نبرد آزما اور اس بات کے کوشاں رہے کہ غیروں کی

غلامی سے ان کا وطن آزاد ہو۔ اس سلسلہ میں ایرانیوں نے اپنے قدیم تمدن، ادب، تاریخ، افسانہ و روایات اور رسم و رواج کو پوری طرح سے محفوظ کر لینے کی سعی کی۔ عربی زبان میں نازل ہونے والے قرآن پر تو وہ ایمان لے آئے مگر دوسرے مفتوح ممالک کی طرح انھوں نے عربی زبان کو اپنی قومی و ملی زبان کی حیثیت سے قبول نہیں کیا، صرف یہی نہیں بلکہ انھوں نے وطن کے قدیم مذہب زردشتیت کے آثار کو نہ صرف بچائے رکھنے کی کوشش کی بلکہ اسی کے پہلو بہ پہلو ایسے نئے نئے دین بھی وضع کرتے رہے جن میں ایران اور ایرانیوں کی عظمت و جلالت کو خاص طور سے نمایاں کیا گیا تھا۔ یہ سلسلہ کافی عرصہ تک چلتا رہا اور آخری بار قاچاریوں کے زمانے میں بہائیت کی شکل میں ظاہر ہوا۔ عربوں اور ترکوں کے عہدِ اقتدار میں جو سیاسی بے چینی، افراتفری، کشاکش و کشمکش، دارو گیر حتیٰ کہ جنگ و جدل دکھائی دیتا ہے۔ ان سب کا محرک ایرانیوں کا اپنے قدیم تمدن، تاریخ اور مذہب کو محفوظ کر لینے یا اس کو نئے نئے قالب میں ڈھال کر پیش کرنے کا جذبہ ہی تھا۔ اس موقع پر ہم ایران کے ایک دوسرے مشہور عالم و محقق، مرحوم پروفیسر سعید نفیسی کا ایک طویل اقتباس نقل کرتے ہیں جس کی مدد سے اس کشمکش و کشاکش اور انتشار و بے چینی کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

"... بزرگ ترین سیاستی کہ برائے رہائی از قید بیگانگان پیش گرفتند نہضت ہائے مذہبی بود واز اواسطِ قرنِ دوم تا اوائل قرنِ چہارم کہ سلسلہ ہائے ایرانی در اکنافِ ایران تاسیس شد و فشارِ بیگانہ را برانداخت چندیں مذہب مختلف در نقاطِ متعددِ ایران بتوسطِ ایرانیان بوجود آمد کہ گاہی اساس آں

... دوسروں (عربوں) کی قید سے رہائی کے لیے مذہبی تحریکوں کو سب سے بڑی حکمتِ عملی کے طور پر استعمال کیا گیا۔ دوسری صدی کے وسط سے لے کر چوتھی صدی کے آغاز تک جبکہ ایرانی سلاطین کے مختلف سلسلوں کی ایران کے مختلف حصوں میں تاسیس ہوئی۔ اور انھوں دوسروں کی قوت و طاقت کو اکھاڑ پھینکا، ایران کے متعدد حصوں میں مختلف قسم کے مذاہب ایرانیوں کے ہاتھوں عالم وجود میں آئے۔

مبنی بر نفاق و تفرقہ درمیان
مسلمانان و افتراقِ عقیدهٔ
ایرانیان باسائر مسلمین
بود، تا بدین وسیله ایران از سلطهٔ
بیگانہ رہا شود۔ «شعوبیہ باصلاح
آن زمان جز ایرانیان نبوده
اند۔ وگاہی ہم رجعت بسوی عقائدِ
زردشتی و احیائے ایرانِ قدیم
اساسِ نہضتی را تشکیل می داد۔
چنانچہ، در مدت صد و پنجاه سال
نظیر نہضت ہائے ابومسلم خراسانی
در اوائل قرن دوم و بہافرید
در ہمان زمان ظہور غالیان و سنباذ
در خراسان وجہیم بن صفوان در ترمذ
و اسحٰق ترک در ماوراءالنہر و روندیہ
در عراق و جمعیت «اسب نوبتی» و
ظہور استاذسیس، در ہرات و باذغیس و
و سیستان و نہضتِ مقنع و سپید جامگان
در ماوراءالنہر در سال ۱۵۹ و ظہور
بابک خرم دین و اصحاب او
بااسم «سرخ علم» در سال ۲۰۱ھ
پیروانِ او مانند «مازیار» و «افشین»
و ظہور عبداللہ بن کرام در
خراسان و تاسیس مذہب
کرامیہ، در اوائل قرن سوم

(ان مذاہب میں سے) بعض ایسے تھے جنکی بنیاد
افتراق بین المسلمین اور ایرانیوں اور دیگر
تمام دوسرے مسلمانوں کے درمیان اختلاف
پر تھی۔ تاکہ اسطرح سے ایران "بیگانوں کے"
اقتدار سے نجات پائے۔ اس زمانے کی اصطلاح
میں جو لوگ شعوبیہ کہلاتے تھے وہ ایرانیوں
کے علاوہ کوئی اور نہ تھے۔ کبھی کبھی یہ مذاہب
قدیم زردشتی عقیدوں کی طرف مراجعت کرتے
اور قدیم ایران کے احیاء کے لیے تحریکیں چلاتے۔
چنانچہ ڈیڑھ سو سال کے عرصہ میں (جو تحریکیں
سامنے آئیں) ان میں سے دوسری صدی
کی ابتداء میں ابومسلم خراسانی اور بہافرید کی
تحریکیں، خراسان میں غالیان اور سنباذ کا
ظہور، ترمذ میں جہیم بن صفوان، ماوراءالنہر
میں اسحٰق ترک عراق میں
روندیہ، ہرات، باذغیس اور سیستان میں
اسپ نوبتی کی جماعت اور استاذسیس کا
ظہور ۱۵۹ھ میں ماوراءالنہر میں مقنع اور
"سفید جامگان" کی تحریکیں ۲۰۱ھ میں
بابک خرم دین اور اس کے ساتھیوں کا ظہور
جو "سرخ علم" کے نام سے موسوم تھے،
اس کے پیروؤں میں مازیار اور افشین
خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں، تیسری صدی
کے اوائل میں خراسان میں عبداللہ
بن کرام کا ظہور اور مذہب کرامیہ کی

"و نهضت قرمطیان در خوزستان
و بحرین در همان زمان و اصحاب
الزنج در سال ۵۵ھ در همان نواحی
و زیدی شدن تمام مردم طبرستان
در سال ۲۵۱ و آغاز کار فرقه ای
از صوفیاء بتوسط حسین بن منصور حلاج
در اواخر قرن سوم و نهضت
های دیگر شبیه بایں همه. برائے
آن بوده است که ایرانیان می کوشیدند
از فشار حکومت عرب خود را
رہا کنند و بهمین جهت مدتِ
نزدیک به سه صد سال کشمکش
دائمی در میان ایرانیان مغلوب
و تازیان غالب در سراسرِ
ایران بوده[1]۔۔۔"

تاسیس ۵۵ھ میں بحرین اور خوزستان میں
قرمطیوں کی تحریک اور اسی زمانے میں اسی
علاقے میں اصحاب الزنج کا ظہور ۲۵۱ھ
میں اسی علاقے میں طبرستان کے تمام لوگوں
کا زیدی ہو جانا۔ حسین بن منصور حلاج کے
ذریعے تیسری صدی کے اواخر میں صوفیاء
کے ایک فرقے کے کام کی ابتداء اور اسی طرح
کی دوسری اور تحریکیں اس لیے چلائی گئیں
کہ ایرانیوں نے اس بات کی کوشش
کی تھی کہ وہ لوگ عربوں کی حکومت کے
زور و قوت سے خود کو نجات دلائیں۔ اسی وجہ
سے تقریباً تین صدیوں تک مفتوح ایرانیوں
اور فاتح عربوں کے درمیان پورے
ایران میں ایک مسلسل کشمکش و کشاکش
جاری رہی۔۔۔

سعید نفیسی کا مندرجہ بالا اقتباس ایرانیوں کی اس طویل، صبر آزما اور پے در پے جدوجہد کی عکاسی کرتا ہے جو مفتوح ہونے کے باوجود انھوں نے فاتح قوم کے خلاف جاری رکھی۔ اس جدوجہد کے دوران لوگ مارے بھی گئے، بے گھر بھی ہوئے ترکِ وطن تک پر مجبور ہوئے مگر فاتح قوم سے عملی یا اور علمی جنگ کرتے رہے۔ وہ جنگ جو ایک طویل عرصہ سے لڑی جا رہی ہو اور جس کے گوناگوں پہلو بھی ہوں وہ ترکوں کے ورود ایران اور اس پر قابض ہو جانے سے یک لخت ختم نہیں ہو سکتی یہ جنگ ترکوں کے عہدِ اقتدار میں بھی کسی نہ کسی شکل میں برقرار رہی ہو گی خواہ اس کی شکل کتنی ہی کیوں نہ بدل گئی ہو۔ جہاں تک مذہب کا سہارا لینے کا سوال ہے اس

---

[1] تاریخ نظم و نثر در ایران و در زبان فارسی جلد اول ص ۱۵-۱۶، طبع تہران ۱۳۴۴ھ ش

سلسلے میں یہ بات خاص طور سے یاد رکھنے کی ہے کہ جب کوئی قوم، نسل یا فرد اپنا مذہب تبدیل کرتا ہے تو تبدیلیِ مذہب کے ابتدائی ایام میں انتہائی راسخ العقیدہ اپنے موقف پر جم جانے والا اور اپنے "دورِ جہالت" سے تمام رشتے منقطع کر لینے والا بن جاتا ہے۔ سعید نفیسی کے مندرجہ بالا اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جس زمانے میں ایرانیوں نے اپنے مذہب کو تبدیل کیا تھا اس زمانے میں بھی دوسری اقوام کے برعکس انھوں نے اپنے ماضی سے اپنا رشتہ منقطع نہیں کیا بلکہ اس کے آثار کو ہر طرح سے محفوظ کر لینے کی کوشش کی۔ ایک ایسی قوم جو غیروں کے زبردست تسلط کے باوجود اپنے ماضی کو سینے سے لگائے رہی ہو یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایک دوسری غیر قوم (ترک) کے آتے ہی اپنے ماضی کی تمام یادوں کو یکسر فراموش کر بیٹھے۔ جہاں تک ڈاکٹر صفا کے بیان کردہ ترکوں کے "کورانہ اور ابلہانہ" عقائد کا سوال ہے، اس سلسلے میں یہ بہتر ہوتا کہ صاحبِ موصوف دو ایک مثالوں سے اپنی بات واضح فرما دیتے تو ان کی بات سمجھنے میں مدد بھی ملتی اور اس کا بھی علم ہو جاتا کہ وہ کونسے "کورانہ اور ابلہانہ" عقائد تھے جن کی باقیات عصرِ حاضر کے ایران میں بھی دیکھی جا سکتی ہیں، لیکن چونکہ ڈاکٹر صفا نے اس سلسلے میں کوئی واضح مثال نہیں دی ہے اس لیے ہمارے لیے یہ کہنا دشوار ہو جاتا ہے کہ صاحب موصوف کے اس ارشاد میں کس حد تک صداقت ہے؟

ڈاکٹر صفا نے یہ بھی لکھا ہے کہ ترکوں نے ایرانیوں کو اپنے ماضی سے تعلق منقطع کر لینے کے دام میں اس طرح گرفتار کیا کہ ان کو بادشاہِ وقت کی مدح سرائی کا عادی بنا دیا جس سے اس دور کے شعرا کی مالی امداد بھی ہوتی اور دربار میں بھی ایک ممتاز و نمایاں مقام حاصل رہتا۔ ڈاکٹر صفا کے نزدیک اس جرم کا سب سے بڑا مجرم محمود غزنوی ہے جس نے اس زمانے کے شعرا کو اپنی مدح میں قصائد لکھنے پر زر و سیم سے لاد دیا۔ ابھی تک تو محمود غزنوی کے فردِ جرم میں سب سے بڑا جرم یہ سمجھا جاتا تھا کہ اس نے فردوسی سے وعدہ خلافی کی لیکن ڈاکٹر صفا اس کو اس سے بھی زیادہ سنگین جرم کا مرتکب قرار دیتے ہیں کہ اس نے ایرانی شعرا کو داد و دہش کے دام میں پھنسا کر ان کو ان کے درخشاں ماضی سے منحرف اور بے نیاز

کردیا۔ ڈاکٹر صفا کا یہ نکتہ نیا اور بہت ہی اہم ہے لیکن اس نکتہ پر ابھی مزید تحقیق و تفتیش کی ضرورت محسوس ہے۔ شاید اس تحقیق کے مکمل ہونے کے بعد تاریخ ادبیاتِ ایران کی کچھ الجھی ہوئی گتھیاں سلجھ جائیں۔

محمود غزنوی کی اس مبینہ شعوری کوشش کے باوجود اس کا عہد ایسے خالص ایرانی نژاد شعراسے خالی نہ تھا جن کی کوششوں سے ایران پاستان کے بہت سے آثار فارسی زبان میں محفوظ کر لیے گئے ایسے شعراء کی فہرست میں فردوسی کا نام سرِ فہرست ہے۔ محمود غزنوی کے عہد حکومت میں شاہ نامۂ فردوسی کے نظم ہونے سے اس حقیقت کا پتہ چلتا ہے کہ اگرچہ ایران پر اس ترک خاندان کا قبضہ ہو چکا تھا اور اس نے ایرانیوں کو اپنے ماضی کو فراموش کر دینے کی طرف راغب بھی کردیا تھا تاہم اس عہد میں بھی ایسے لوگ موجود تھے جو ایران کی عظمت پاستان کے نقیب و نغمہ سرا تھے۔ اس حقیقت کے انکشاف سے اس بات کا مزید انکشاف ہوتا ہے کہ وہ خواہ عربوں کا دور حکومت ہو یا ترکوں کا پانچویں صدی ہجری تک ایرانی بہر حال اپنی قدیم تاریخ، تمدن، مذہب، روایتوں اور داستانوں سے ہر دور میں نہ صرف واقف رہے بلکہ اس کو جدید زبان (فارسی) میں محفوظ کر لینے کی سعیِ پیہم بھی کرتے رہے۔ اسی لیے ہمارا خیال یہ ہے کہ ترکوں کے عہد اقتدار کو ایران میں قومی و ملی رزمیہ نگاری کے زوال و خاتمہ کا ذمہ دار قرار دینا کافی نہیں ہے بلکہ اس کے دوسرے اسباب تک بھی رسائی حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔

ڈاکٹر صفا کے نزدیک چھٹی صدی ہجری قومی و ملی رزمیہ نگاری کے زوال کا عہد ہے۔ اس صدی میں ایران کی جو سیاسی حالت اور اندرونی کشمکش و کشاکش تھی اور جس کی وجہ سے ایران میں شعر و ادب کو ایک گونہ زوال کا بھی سامنا کرنا پڑا اس کی طرف سعید نفیسی نے ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے!

"... از سوی دیگر تخم فتنہ و فساد	دوسری طرف فتنہ و فساد کا وہ بیج
کہ اسمٰعیلیہ در ایران پاشیدہ و تعصب	جو اسمٰعیلیہ نے بویا اور عربوں اور ترکوں
ایرانی بسیار بسختی در برابر تازیان	کے خلاف جو شدید تعصب وہ رکھتے تھے،
و ترکان داشتہ اند امن و آسائش	اس نے عام لوگوں سے سکون اور اطمینان

را از مردم گرفته بود و هر کسے که با ایشاں
بمدست نمی شد در خطر نابود شدن بود
. بہمین جہت آں آسودگی و آرامشی
که برائے ادبیات لازمست در برخی
از نواحی ایران نه بود و گذشته از فتنهٔ
اسمٰعیلیہ جنگ درمیان شافعیان و
وحنفیان در ایران ومخصوصاً در نواحی
مرکزی وگاہی نیز اختلاف درمیانِ شیعہ
واہل سنت روی می داد وگاہی کشتار
ہائے خونین پیش می آمد و از
دو سوئے آسائش بہم می خورد
سرانجام ہمیں فسادہا و ناتوانی ہائے
روحانی واختلافہا بود کہ در آغاز
قرنِ ہفتم پائے مغول را با یران باز
کرد و آنچہ نمی بایست بشود
شد۔[1]

چھین لیا تھا۔ ہر وہ شخص جو ان کے ساتھ نہ ہوتا وہ فنا کے خطرات سے دوچار رہتا۔ اسی وجہ سے وہ امن وسکون جو ادبیات کے لیے ضروری ہے ایران کے بہت سے علاقوں میں وجود نہ رکھتا تھا۔ اسمٰعیلیوں کے فتنے کے علاوہ ایران میں بالخصوص اس کے مرکزی علاقوں میں شافعیوں اور حنفیوں کی جنگیں اور کبھی کبھی شیعوں اور سُنّیوں کے اختلافات بھی ظاہر ہوتے (جس کے نتیجے میں) خونیں جنگیں بھی ہوتیں اور دونوں فریقوں کا آرام وسکون غارت ہوتا۔ نتیجہ کے طور پر اسی فتنہ وفساد، روحانی کمزوریوں اور اختلافات نے ساتویں صدی کے شروع میں منگولوں کو ایران میں قدم جمانے کا موقع دیا اور جو کچھ نہیں ہونا چاہیے تھا وہ سب کچھ ہوا۔

پروفیسر سعید نفیسی مرحوم کے اس اقتباس سے بہت واضح طور سے اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ چھٹی صدی ہجری میں بھی جو ڈاکٹر صفا کے نزدیک قومی وملّی رزمیہ نگاری کے زوال کا عہد ہے، ایران میں ترکوں اور عربوں سے نفرت کرنے والے نہ صرف موجود تھے بلکہ وہ لوگ جہاں تک بن پڑتا کشت وخون سے بھی دریغ نہ کرتے۔ قومی وملّی رزمیہ نگاری کو مہمیز کرنے والی چیزوں میں ڈاکٹر صفا نے شعوبیت کا خاص طور سے ذکر کرتے ہوئے اپنی اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ اسی تحریک کی وجہ سے ایرانی قوم اپنے آبا و اجداد اور ان کے کارناموں کو فراموش نہ کرنے پائی۔

---

[1] تاریخ نظم ونثر در ایران و در زبان فارسی جلد ص ۳ ۷۔۸۷

چھٹی صدی ہجری میں اگرچہ شعوبیت کا وہ زور نہیں رہا لیکن اس سیاسی تحریک کی ایک مذہبی توسیع باطنیت کی شکل میں نہ صرف موجود تھی بلکہ ایک زبردست عامل کی حیثیت سے پورے ایران کی رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے تھی جس کی زد سے عرب تو عرب خود مذہبِ اسلام بھی محفوظ نہ تھا۔ ایک ایسی فضا میں جہاں غیر ایرانیوں سے سخت بیزاری، ہو اور ایک ایسی مذہبی تحریک کی موجودگی میں جو درپردہ شعوبیت کے افکار و خیالات کی مبلغ و منادی ہو، ایرانی قوم کا اپنے آبار و اجداد اور ان کے کارناموں کو یکسر فراموش کر دینا بڑے تعجب کی بات ہے۔ ہمارے نزدیک یہ درست نہیں ہے کہ چھٹی صدی ہجری میں ایرانیوں نے اپنے آبار و اجداد اور ان کے کارناموں کو بالکل بھلا دیا البتہ اس صدی میں یہ ضرور ہوا کہ عظمت پاستان کے جو نغمے الاپے جاتے تھے اس کی لے بالکل مدھم پڑ گئی۔ اس صورتِ حال کے پیدا ہونے کی وجہ ایران کی وہ داخلی کشمکش و کشاکش ہو سکتی ہے جو اسمٰعیلیوں اور غیر اسمٰعیلیوں، شیعوں اور سنیوں، حنفیوں اور شافعیوں میں زور و شور سے برپا تھی۔ اس صورت حال کے پیدا ہونے کی ذمہ داری صرف فاتح ترکوں پر ہی عائد نہیں ہوتی بلکہ ایران کے تمام مسلمان اس صورت حال کی ذمہ داری سے بری قرار نہیں دیے جا سکتے۔ اگر ترکوں کا قدم ایران میں نہ بھی آتا اور یہ مذہبی مناقشے ان کی غیر موجودگی میں ہوتے تو بھی ان کے وہی اثرات مترتب ہوتے جو سلاجقہ یا بعد کے بادشاہوں کے دورِ حکومت میں مترتب ہوئے۔ اسی لیے ہمارے خیال میں ایران کی قومی و ملی رزمیہ نگاری کے زوال کا ذمہ دار ترکوں کے اقتدار اور حکومت کو قرار دینا مناسب نہیں ہے۔

ڈاکٹر صفا نے صفوی بادشاہوں کی مذہبی سیاست کو بھی ترکوں کے اثرات کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک اس مذہبی سیاست کی وجہ سے ایران میں جو کشت و خون اور فتنہ و فساد کا بازار گرم ہوا اس نے ادبیات ایران کی پیش رفت کو بہت نقصان پہنچایا۔ اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ صفوی خاندان کے تسلط نے ایران کی تاریخ کو ایک نیا موڑ دیا، اس نئے موڑ کے اچھے اور برے دونوں ہی پہلو تھے جن کو ایرانی قوم مدتوں تک جھیلتی رہی لیکن یہ بات کسی طرح سمجھ میں نہیں آتی

ر صفوی خاندان کے عروج، ایران کی سلطنت پر قبضہ اور مذہب کی آڑ لے کر ان کا کشت و خون کرنا، ان باتوں کی ترکوں کے قدموں کی "برکت" کیسے کہا جا سکتا ہے۔ اس زمانے کے ایران کی صورتِ حال کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے یہاں پھر پروفیسر سعید نفیسی کا ایک دوسرا طویل اقتباس نقل کر دینا بہت ضروری ہے۔ صاحب موصوف دسویں صدی ہجری کے ایرانی ادب پر بحث کرتے ہوئے رقم طراز ہیں!

"پادشاہانِ صفوی توجہی بادبیات نداشتند زیرا کہ ہمہٗ کوشش آنہا متوجہ انتشار طریقۂ شیعہ و پیش رفت سیاستِ مذہبی و بستن سدی استوار در برابر استیلای ازبکانِ سنی ماوراالنہر و عثمانیانِ سنی آسیای صغیر و فراہم کردن تعصب و کینہٗ مذہبی بسیار شدید و دامن زدن آتشِ اختلاف بود و برائے ایں کار تنہا احتیاج بادبیات عامیانہ ای داشتند کہ در میانِ مردم زیر دست و خردہ پا فراہم کنند مانند نوحہ و تعزیہ و مثالِ آں و گاہی شاعرانی راکہ در بارہٗ شہدائے کربلا مراثی می سرودند تشویق می کردند و در انتشارِ علوم نیز توجہی نداشتند و تنہا بنشر معارف شیعہ ہمت می گماشتند چوں برائے ایں کار در ایران کہ اکثریت مردم آں پیش از پادشاہی ایشان سنی بودند شمارہٗ

صفوی بادشاہ ادبیات کی طرف راغب نہ تھے کیونکہ ان کی ساری کوششیں شیعہ مسلک کی اشاعت، مذہبی سیاست کی پیش رفت اور ماوراالنہر کے سنی ازبکوں اور ایشیائے کوچک کے سنی عثمانیوں کے بالمقابل ایک مضبوط دیوار بنانے اور انتہائی شدید قسم کے مذہبی تعصب و کینہ کی آفرینش اور اختلاف کی آگ بھڑکانے کے لیے وقف تھیں اس مقصد کے حصول کے لیے ان کو صرف عامیانہ ادبیات کی ضرورت تھی جس کو وہ دبے اور کچلے ہوئے عوام کے سامنے پیش کر سکیں مثلاً نوحہ، تعزیہ، دیہ جذباتی ڈرامے واقعاتِ کربلا سے متعلق ہوتے ہیں) اور اسی قبیل کی دوسری چیزیں۔ کبھی کبھی یہ بادشاہ اُن شعراء کی ہمت افزائی بھی کرتے جو شہدائے کربلا کے سلسلے میں مرثیے نظم کرتے۔ صفوی بادشاہ علوم کی اشاعت کی طرف بھی راغب نہ تھے اور صرف شیعہ تعلیمات کی نشر و اشاعت تک ہی محدود رہتے چونکہ ان

لازم دانشمندان نمی یافتند ناچار عدهٔ کثیری از پیشوایان شیعهٔ کشورہائے تازی زبان مانند بحرین و لحار و جبل عامل و نواحی دیگر دمشق و سوریه را با یران آوردند و ایشان را بایں کار گماشتند و آنہا ہم فارسی زبان نبودند و تعلیمات خود را بزبان تازی میدادند و نتیجه ایں شد کہ زبان تازی کہ پس از برافتادن خلافتِ بغداد در اواسط قرن ہفتم در ایران روز بروز ضعیف ترشده و آں استیلائی کہ بعنوان زبانِ علمی در نتیجهٔ قدرت خلفائے بغداد پیدا کرده بود از میانِ رفته و اندک واندک زبانِ فارسی در احتیاجاتِ علمی جائے آں را گرفته بود بدستیاری ایں پیشوایانِ تازی کہ از کشورہائے بیگانه آمده بودند دوباره زبانِ علمی و دینی ایران شد و بازبنای تالیف را بزبان تازی گذاشتند و ایں تقریباً تا اواخر سلطنت تا اوائل قرن دوازدہم باقی بود[1]۔۔۔"

بادشاہوں کے اقتدار سے قبل ایران کے بیشتر لوگ سنی تھے اس لیے ان کو اس کام کے لیے دانشمندوں کی معتد بہ تعداد میسر نہ تھی اس لیے مجبوراً یہ لوگ ان شیعہ پیشواؤں کی ایک کثیر تعداد کو ایران میں لے آئے جنکی زبان عربی تھی اور وہ لوگ بحرین، لحار، جبل عامل، دمشق اور شام وغیرہ دوسرے مقامات کے رہنے والے تھے۔ ان دانشمندوں کو صفوی بادشاہوں نے مذکورہ کام پر لگایا۔ ان کی زبان فارسی نہ تھی اور یہ لوگ اپنی تعلیمات عربی میں پیش کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ عربی زبان جو ساتویں صدی ہجری میں خلافت بغداد کے خاتمے کے بعد سے ایران میں روز بہ روز کمزور ہو رہی تھی، اور خلفائے بغداد کی زبان ہونے کی وجہ سے اس کو علمی زبان کے عنوان سے جو علمی تسلط حاصل تھا وہ ختم ہو چکا تھا اور رفتہ رفتہ علمی ضروریات کے لیے فارسی زبان اس کی جگہ لینے لگی تھی، ان عربی زبان پیشواؤں کی مدد سے جو کہ دوسرے ممالک سے آئے تھے دوبارہ ایران کی مذہبی اور علمی زبان بن گئی اور دوبارہ عربی زبان میں تصنیف و تالیف کے کام کی ابتدا کی گئی یہ صورتِ حال تقریباً بارھویں صدی کے اوائل تک باقی رہی۔۔۔

---

[1] سعید نفیسی، بحوالہ سابق ص ۲۵۲، ۲۵۳

پروفیسر سعید نفیسی کے اس اقتباس سے جو نتیجہ برآمد ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ مذہبی مناقشے کی وجہ سے فارسی ادب کی پیشرفت بری طرح متاثر ہوئی صرف یہی نہیں بلکہ غیر ایرانی مذہبی عالموں کے عمل دخل کی وجہ سے خود فارسی زبان کو بھی سخت نقصان ہوا اور انقراضِ سلطنت بغداد کے بعد فارسی زبان نے اپنے ملک میں جو جگہ حاصل کرلی تھی صفوی بادشاہوں کی مذہبی سیاست کی وجہ سے فارسی زبان کو اس جگہ سے دستکش ہونا پڑا اور اس کی جگہ دوبارہ عربی زبان نے لے لی جس کی وجہ سے ایک بار پھر فارسی زبان کو اپنے ہی ملک میں دوسرے درجے کے شہری کی حیثیت سے اپنے وجود کو باقی رکھنا پڑا۔ ان سب باتوں کے درست ہونے میں کوئی کلام نہیں لیکن صفوی بادشاہوں کی اس مذہبی سیاست کی ذمہ داری ترکوں پر کس طرح عائد کی جاسکتی ہے اور یہ کس طرح کہا جاسکتا ہے کہ یہ سب بلائیں ترکوں کی وجہ سے ایران پر نازل ہوئیں جن کی بدولت ایران میں قومی وملی رزمیہ نگاری کو زوال کا سامنا کرنا پڑا؟

ایران میں قومی وملی رزمیہ نگاری کے زوال کی اصل وجہ وہی ہے جس کو ڈاکٹر صفا نے "تکاملِ افکار و اسالیبِ ادبی" کا نام دیا ہے اس سلسلے میں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ ہر دور کا ادب اس دور کے مخصوص حالات اور تقاضوں کے تحت تراش خراش کے مراحل سے دوچار ہوتا ہے، اس کو جو چیزیں بھی ورثہ میں ملتی ہیں ان میں کچھ اس کے لیے بیکار اور بے فائدہ ہوتی ہیں جن کو ترک کردیا جاتا ہے کچھ چیزیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو ہوتی تو مفید اور کارآمد ہیں مگر بدلے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دینے سے قاصر ہوتی ہیں، ان چیزوں میں مناسب ترمیم و توسیع کرکے ان کو زمانے کے تقاضوں کا ساتھ دینے والا بنا لیا جاتا ہے پھر بھی بہت سے تقاضے اور مسائل ایسے باقی رہ جاتے ہیں جن کی عکاسی کے لیے ادبیات کو نئی نئی چیزیں وضع بھی کرنی پڑتی ہیں اور اسی ترمیم و تنسیخ، توسیع اور اضافوں کی مدد سے ادبیات کا کارواں آگے بڑھتا رہتا ہے۔ فردوسی کی شاعری اپنی جگہ پر خواہ کتنی ہی خوبصورت اور اہم کیوں نہ ہو وہ اپنے مخصوص عہد کی پیداوار تھی۔ فردوسی کے بعد کے شعراء کے زمانوں کے مسائل اور تقاضے فردوسی کے عہد کے مسائل اور تقاضوں سے بالکل

مختلف تھے اسی لیے فردوسی کے بعد کے شعراء نے فردوسی کی شاعری کی اہمیت اور خوبصورتی کو قبول کرتے ہوئے بھی فردوسی کی روش کو نہ صرف ترک کیا بلکہ اپنے اظہار خیال کے لیے نئی نئی راہیں بھی نکالیں۔ صرف فردوسی ہی نہیں بلکہ خاقانی، مولانا روم، عطار، سنائی، سعدی اور حافظ سب ہی شعراء کے ساتھ ایسا ہی ہوا۔ ان تمام شعراء کی اہمیت اپنی جگہ مسلم، ان کی عظمت میں کسی کو کلام نہیں لیکن ان کا اندازِ بیان، اسلوب اور موضوعات ان کے اپنے زمانوں کے تقاضوں اور مسائل کو سامنے رکھتے ہوئے اختیار کیے گئے تھے ان مسائل اور تقاضوں کے ختم ہو جانے کے بعد اگر وہی اندازِ بیان، اسلوب اور موضوعات اختیار کیے جائیں تو نہ صرف اپنے زمانے کے مسائل سے روگردانی ہوتی ہے بلکہ اس سے بے انصافی بھی ہوتی ہے۔ اس حقیقت کے باوجود بھی اگر کوئی شاعر اپنے پیشرووں کی روش پر ہی قائم رہتا ہے تو وہ ڈاکٹر صفا ہی کی زبان میں سُنّتی TRADITIONAL کہلانے کا مستحق ہے جس کو خود ڈاکٹر صفا بھی اُگلے ہوئے نوالے چبانے والا سمجھتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر آج فریدون تولّی یا بامداد، حافظ، سعدی یا مولانا روم کی پیروی کرتے ہوئے انہی کے جیسے اشعار کہنے کی کوشش کریں تو کیا وہ عصرِ حاضر کے پیچ در پیچ مسائل اور ان کے تقاضوں کی عکاسی سے عہدہ برآ ہوسکیں گے؟ ایران میں قومی و ملّی رزمیہ نگاری کا زوال قانونِ فطرت کے عین مطابق ہوا۔ جب یہ صنفِ سخن اپنے انتہائی عروج پر پہنچ گئی اور اس میں کسی مزید اضافہ کی کوئی گنجائش باقی نہ رہی تو پہلے اس پر جمود طاری ہوا اور بعد ازاں انحطاط کی طرف مائل ہوگئی۔ جس عہد میں قومی و ملّی رزمیہ نگاری اپنے عروج پر تھی اس عہد کا تقاضا یہی تھا کہ جو قومی و ملّی رزمیہ داستانیں اِدھر اُدھر بکھری پڑی ہیں ان سب کو یکجا کر کے مفصّل، مربوط اور دلکش انداز میں اس طرح نظم کر لیا جائے کہ بعد کے آنے والوں کے لیے اس دور اور اس کے تقاضوں کو سمجھنے میں آسانی ہو۔ زمانے کے بدلنے کے ساتھ ساتھ مسائل بھی بدلتے گئے۔ بدلے ہوئے حالات میں قومی و ملّی رزمیہ نگاری بے وقت کی راگنی معلوم ہونے لگی۔ اسی لیے فارسی شعراء دوسرے

دوسرے موضوعات اور اسالیب کی طرف متوجہ ہوئے۔ یہی قانونِ فطرت ہے اور دنیا کی ہر زبان کے ادب میں اسی قانون کی کارفرمائی دیکھی جا سکتی ہے۔ اس قانونِ فطرت سے فارسی ادب کس طرح مستثنیٰ رہ سکتا تھا؟ یہی وجہ ہے کہ اپنے زمانے کے تقاضوں کو پورا کرنے کے بعد ایران کی قومی و ملی رزمیہ نگاری ختم ہوکر تاریخ ادبیات کا ایک تابندہ ورق بن گئی۔ اس تابندگی سے اکتسابِ نور تو کیا جا سکتا ہے مگر حرارت نہیں حاصل کی جا سکتی۔

قومی و ملی حماسہ سرائی (رزمیہ نگاری) کی تاریخ، ارتقا، زوال اور زوال کے اسباب کا مفصل اور مربوط جائزہ لینے کے بعد ڈاکٹر صفا نے تاریخی اور مذہبی رزمیوں کا بھی اسی شرح و بسط سے جائزہ لیا ہے اور جس حد تک ممکن ہو سکا ہے انھوں نے اس ضمن میں آنے والی تمام رزمیہ منظومات کا محققانہ اور ناقدانہ نظر سے مطالعہ کرنے کے بعد اپنا حاصلِ مطالعہ قارئین کے سامنے پیش کردیا ہے طوالت کے خیال سے ہم ان ابواب سے صرف نظر کرتے ہوئے اس کتاب کے اس حصہ پر ایک نظر ڈالتے ہیں جس میں قدیم ایران کے دو شاہی خاندانوں پیش دادیوں اور کیانیوں کے بارے میں ڈاکٹر صفا نے بحث کرتے ہوئے اپنے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ ان خاندانوں کی بھی وہی تاریخی حیثیت ہے جو مادیوں، ہخامنشیوں، اشکانیوں یا ساسانیوں کی ہے۔ اس موضوع پر ابھی تک بہت کم کام ہو سکا ہے اور جو کچھ لکھا بھی گیا ہے وہ افراط و تفریط کا شکار ہو کر رہ گیا ہے۔ اس لیے بہتر معلوم ہوتا ہے کہ اس موضوع پر ڈاکٹر صفا نے جو افکار و خیالات پیش کیے ہیں ان کا غیر جذباتی انداز سے جائزہ لے کر ان کے مفروضات کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔

عصرِ حاضر کے مورخین جب بھی ایران کی تاریخ پر قلم اٹھاتے ہیں تو آلِ ماد کے زمانے سے اپنے کام کی ابتدا کرتے ہیں اور ان سے پہلے کے شاہی خاندانوں پیش دادیوں اور کیانیوں کے ذکر کو "خرافات" سمجھ کر اس سے اغماض برتتے ہیں مورخین کی اس روش کی وجہ سے شاہ نامہ کی وہ تمام روایتیں اور حکایتیں جھوٹ، خرافات اور بکواس کے ضمن میں شمار ہونے لگتی ہیں جن میں ہوشنگ، جمشید، کیقباد،

کاؤس اور کیخسرو جیسے سلاطین کا ذکر آیا ہے ان میں ان بادشاہوں کے حالات اور کارنامے بیان کیے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر صفا کا موقف یہ ہے کہ ایران کی ملّی داستانیں، شاہ نامے اور رزمیے قدیم ایران کی تاریخ کے عکاس ہیں اور ان کے مندرجات وقوعاتِ تاریخی پر مشتمل ہیں البتہ اس امر کو ماننے میں ڈاکٹر صفا کو بھی کوئی تامل نہیں ہے کہ مرور ایام کے نتیجہ میں ان ملی داستانوں اور روایتوں میں بھی بہت سے افسانوی اور خیالی اجزا مل گئے ہیں جن کی وجہ سے ان داستانوں کی تاریخی حیثیت پر بہت گہرا افسانوی غبار چھا گیا ہے۔

ڈاکٹر صفا نے اس خیال کا بھی اظہار کیا ہے کہ ایران کی ملی رزمیہ نظموں میں جو اساطیری اور افسانوی کردار ملتے ہیں وہ بالکل خیالی نہیں ہیں بلکہ ان کی بھی تاریخی حیثیت ہے ان کرداروں میں سے بعض بعض کرداروں کے آثار ہندووں کی ملی اور مذہبی روایتوں میں آج تک محفوظ ہیں اور انہی کرداروں کا ذکر اوستا میں بھی دیکھا جا سکتا ہے جو اس سلسلے کی قدیم ترین کتابوں میں محسوب ہوتی ہے۔

اوستا کے جو اشعار اور ٹکڑے ہم تک پہنچے ہیں ان میں مستشرقین کی تحقیق کے مطابق "گاتاہا" کے نام سے جو حصہ موسوم ہے وہ زردشت کا ہی تصنیف کردہ ہے۔ اس لحاظ سے "گاتاہا" اوستا کا قدیم ترین حصہ ہے۔ "گاتاہا" میں گشتاسپ اور اس کے چند دوسرے معاصروں کا ذکر موجود ہے۔ اسی طرح سے قدیم یشتوں (یشتہا) کے وہ ٹکڑے جو نویں اور دسویں صدی قبلِ مسیح سے متعلق ہیں ان میں بھی پیش دادی اور کیانی بادشاہوں کے نام دیکھے جا سکتے ہیں۔ گاتاہا اور یشتہا کے مطالعہ سے ڈاکٹر صفا کے اس خیال کی تصدیق ہوتی ہے کہ وہ کردار جو شاہ ناموں اور دوسری روایتوں میں اساطیری کردار کی شکل میں پیش کیے گئے ہیں اصلاً حقیقی اور تاریخی کردار تھے جو وقت کے بدلنے کے ساتھ ساتھ بتدریج اساطیری کردار کی شکل میں ڈھل گئے ہیں۔ گاتاہا میں گشتاسپ اور اس کے درباریوں کا جو ذکر ہے اس کی موجودگی میں گشتاسپ کی تاریخی شخصیت ہونے سے انکار کرنا حقیقت سے منھ پھیر لینے کے مترادف ہے۔ ڈاکٹر صفا کے خیال میں جب گشتاسپ کی تاریخی حیثیت مسلّم ہو جاتی ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم اس کے اجداد مثلاً "کے" (اوستا میں اس کو کوی

Kavi یا کو Kava کے نام سے یاد کیا گیا ہے، کی تاریخی حیثیت سے انکار کریں جس کا ذکر فروردین یشت اور آبان یشت جیسے قدیم یشتوں تک میں موجود ہے اسی طرح سے بہت سے وہ کیانی بادشاہ جو اپنی اہمیت اور زور و قوت کی وجہ سے بہت مشہور تھے ان کا ذکر قدیم ترین سنسکرت ادب میں بھی محفوظ ہے جن کا ذکر ہم آگے کریں گے۔

پیش دادی سلاطین میں جمشید، اس کا باپ یونگھان، فریدون اور اس کا باپ اتھویہ ایسی شخصیتیں ہیں جن کا ذکر ویدوں میں بھی محفوظ ہے۔ ویدوں میں ان شخصیتوں کا ذکر موجود ہونے کی بنا پر یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ یہ سلاطین ہندوستانی اور ایرانی آریاؤں کے مشترک بادشاہ تھے اور ان کا زمانۂ حکومت وہ زمانہ ہے جب ہندوستانی اور ایرانی آریا ایک جگہ رہتے سہتے اور ایک ہی مذہب کے پیرو تھے۔ مذکورہ سلاطین نے اپنی قوم کے لیے جو خدمات انجام دیں وہ اس قوم کے نزدیک اتنی اہم اور یاد رکھنے کے قابل تھیں کہ ان کو مذہبی کتاب اوستا میں محفوظ کر دیا گیا اور جب آریوں کا ایک گروہ ہندوستان آیا اور اس نے اپنی مذہبی کتاب وید کو مرتب کیا تو ان بادشاہوں کے ذکر کو بھی محفوظ رکھا۔ ان تمام حقائق کو پیش نظر رکھتے ہوئے ڈاکٹر صفا کا یہ خیال ہے کہ پیش دادی اور کیانی بادشاہوں کو اساطیری کردار نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ یہ حقیقی اور تاریخی کردار ہیں جن کا ذکر بعد کے شاہناموں میں بھی محفوظ کر دیا گیا ہے۔

ان خیالات کے اظہار کے بعد ڈاکٹر صفا نے پیش دادی سلاطین کے مفصل حالات سے بحث کرتے ہوئے ان کی تاریخی حیثیت کو اجاگر کرنے کی سعی کا آغاز لفظ "پیش دادی" کی تحقیق سے کیا ہے اور وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ لفظ پیش دادی اوستائی لفظ "پرذات" کا ہم معنی ہے، اس لفظ کے معنی کے سلسلے میں محققین کے درمیان خاصہ اختلاف ہے محققین کے ایک گروہ کے نزدیک اس اوستائی لفظ کا ترجمہ "وہ جس نے اول اول آئین بنایا" ہے لیکن دوسرے گروہ کے نزدیک یہ ترجمہ درست نہیں ہے بلکہ اس کا خیال ہے کہ اس کا ترجمہ "اولین مخلوق" ہونا چاہیے۔ ڈاکٹر صفا نے اپنے دلائل کی بنا پر محققین کے پہلے قول کو صحیح قرار دیا ہے اور اس پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اس کے بعد انھوں نے گیومرث، ہوشنگ، تہمورث، جمشید، ضحاک، فریدون، ایرج، منوچہر، نوذر، زاب اور

گرشاسپ کے حالات بہت تفصیل سے لکھے ہیں اور قدیم ترین و جدید ترین مآخذ کی مدد سے ان کی تاریخی حیثیت کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔" حماسہ سرائی در ایران" کا یہ حصہ قدیم ایران کی تاریخ کے اس تاریک گوشے کو منور اور واضح کر دیتا ہے جس پر شک و شبہ کی گرد چھائی ہوئی تھی۔

ایران کی ان قدیم قومی روایتوں کی رو سے جن کی بنیاد پر بعد میں منثور اور منظوم شاہ نامے لکھے گئے ہیں، پیش دادی خاندان کے زوال کے بعد کیانی خاندان کا عروج ہوا جس نے ایک مدت تک سرزمینِ ایران پر حکمرانی کی، لیکن بہت سے محققین کے نزدیک اس خاندان کا بھی وجود پیش دادیوں ہی کی طرح افسانوی ہے تاریخی نہیں۔ اس خیال کے بالکل برعکس محققین کا ایک گروہ ایسا بھی ہے جو کیانیوں کی تاریخی حیثیت کا قائل ہے اور پہلے گروہ کے محققین کی تحقیق کو غلط سمجھتا ہے ڈاکٹر صفا کے نزدیک اس سلسلہ میں خلط مبحث وہاں سے شروع ہوتا ہے جہاں بعض مستشرقین نے کیانیوں اور ہخامنشیوں کو ایک ہی خاندان کے افراد کی حیثیت سے پیش کیا ہے حالانکہ کیانی خاندان کا شمار نیم تاریخی خاندانوں میں اور ہخامنشیوں کا تاریخی خاندانوں میں ہونا چاہیے۔ ڈاکٹر صفا کے خیال میں اس خلط مبحث کا سبب کیانی اور ہخامنشی بادشاہوں کے ناموں کا اشتراک ہے انھوں نے اس سلسلے میں مثال دیتے ہوئے اپنی بات کی وضاحت کی ہے کہ کس طرح کیانی بادشاہوں کو ہخامنشی بادشاہ سمجھ لیا گیا۔ مستشرقین میں سب سے پہلے ہرٹل Heriel نے اور اس کے بعد اسی کے اتباع میں ہرٹسفلڈ Hertz feld نے بہت ہی مفصل انداز میں بہت سی مزید توضیحات کے ساتھ اسی خیال کا اعادہ کیا ہے۔ ہرٹل نے اپنی کتاب "کیانیان و ہخامنشیان" میں اپنے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ جو سلاطین سلسلۂ کیانی کے آخری سلاطین سمجھے جاتے ہیں اصل میں وہ ہخامنشی سلاطین ہیں جن کو غلطی سے کیانی سمجھ لیا گیا ہے۔ ہرٹل نے "زمانِ زردشت" نامی کتاب کے اس قول کی بھی نفی کی ہے کہ زردشت نے اپنی زندگی داریوش اول کے باپ ویشتاسپ کے دورِ حکومت میں بسر کی ہے۔" ہرٹل کا یہ بھی خیال ہے کہ کیانی خاندان کے شروع کے سلاطین یعنی کیقباد سے کیخسرو تک

سلاطین نہیں بلکہ مغربی ایران کے قبائل کے سردار تھے ممکن ہے کہ اِن افراد کی کچھ تاریخی حیثیت ہو لیکن ان کے علاوہ جتنے بھی اور کیانی بادشاہ گزرے ہیں وہ سب کے سب ہرٹل کے خیال کے مطابق ہخامنشی بادشاہ تھے جن کو ایک فرضی یا خیالی خاندان سلاطین (کیانی) میں شمار کر لیا گیا ہے ہرتسفلڈ اس سلسلے میں ایک قدم اور آگے بڑھ گیا ہے اور اس نے اس بات کا دعویٰ کیا ہے کہ کیانی سلاطین اصلاً مادی سلاطین تھے جن کا تذکرہ ہرودوٹس اور کتریاس جیسے مورخین نے کیا ہے۔ ہرتسفلد کے خیال میں کوروش نام کا بادشاہ وہی بادشاہ ہے جس کو کیخسرو کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں دوسرے مستشرقین سے بھی جن لغزشوں کا صدور ہوا ہے ان کا ذکر کرنے کے بعد ڈاکٹر صفا نے اپنے خیال کا اظہار اِن الفاظ میں کیا ہے!

«بعقیدهٔ من آمیختن شاهان اوستائی کیان با پادشاهان تاریخی مادی و ہخامنشی خطائی بین و آشکارا است چه بنا بر آنچه قرائن متعدد تاریخی و نیز با تحقیق در زمانِ زردشت بر می آید پادشاہان کیان یعنی کسانیکه در اوستا با لقب "کوی" ذکر شده اند و آخرین ایشان "کوی ویشتاسپ" است و در وجود تاریخی آنان ہم نمی توان کاملاً تردید کرد، متعلق بعهد قدیم تر از زردشت و عبارت بوده اند از روسائے معروف قبائل مشرق و شمال مشرق ایران که پس از رسیدن بمقام فرمانروائی و عظمت بلقب "کوی" یعنی شاه ملقب شده اند درصورتیکه پادشاہان

میرے خیال میں اوستائی بادشاہوں یعنی کیانیوں اور تاریخی بادشاہوں، مادیوں اور ہخامنشیوں کو باہم دگر ملانا ایک کھلی ہوئی اور واضح غلطی ہے کیونکہ جو کچھ بھی متعدد تاریخی قرینوں اور زردشت کے عہد پر تحقیقات کرنے سے نتیجہ حاصل ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ کیانی بادشاہ یعنی وہ لوگ جن کا ذکر اوستا میں "کوی" کے لقب سے ہوا ہے اور جن کا آخری بادشاہ "کوی ویشتاسپ تھا ان کے تاریخی وجود کی مکمل طور سے نفی بھی نہیں کی جا سکتی زردشت کے عہد سے بھی پہلے کے ایران کے مشرقی اور شمالی مشرقی قبیلوں کے وہ سردار جو بادشاہت کے منصب تک پہنچے اور "کوی" کے لقب سے ملقب ہوئے۔ حالانکہ جیسا کہ متعدد تاریخی شواہد سے ثابت ہوتا ہے مادی اور ہخامنشی

ماد و ہخامنشی چنانچہ شواہد و مدارک متعدد تاریخی ثابت می کند پادشاہان مغرب و شمال غرب و جنوب و مرکز ایران بودہ و ازمیان آنان تنہا دستہ آخیر توانستہ اند برقسمت ہائے خاوری ایران حکومت یابند و عنوانِ سلطنتی آنان خشائی ثی یعنی شاہ است' ایں گروہ از لحاظ زمان ہم متاخر از زردشت اند وایں کہ برخی خواستہ اند بزحمتِ ویشتاسپ پدر داریوش را ہمان "کوی ویشتاسپ" حامی زردشت بدانند اشتباہ کردہ اند[1]"

بادشاہ مغرب، شمال مغرب جنوب اور مرکزی ایران کے بادشاہ تھے۔ ان بادشاہوں میں سے صرف آخیر کے زمانے کے بادشاہ اس قابل ہو سکے کہ وہ ایران کے مشرقی حصے پر حکومت کریں۔ ان لوگوں کا شاہی لقب "خشائی ثی" یعنی بادشاہ ہے۔ یہ گروہ اپنے عہد کے لحاظ سے بھی زردشت سے متاخر ہے اور جن حضرات نے بدقت تمام اس بات کی کوشش کی ہے کہ ویشتاسپ کو وہی "کوی ویشتاسپ" ثابت کریں جو زردشت کا زبردست حامی تھا ان حضرات نے غلطی کا ارتکاب کیا ہے۔

ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس کی تصدیق مشہور و معروف مستشرق کریسٹن سن کی تحریر سے بھی ہوتی ہے اسی لیے اس موقع پر ڈاکٹر صفا نے کریسٹن سن کے خیالات کا خلاصہ بھی نقل کر دیا ہے۔ اس سلسلے میں کریسٹن سن کے خیالات مختصر طور پر یوں بیان کیے جا سکتے ہیں۔

۱۔ ایران کا مشرقی حصہ زردشتی مذہب کا مولد و گہوارہ ہے اور وہ زبان جو اوستا کے قدیم حصوں میں ملتی ہے دراصل مشرقی ایران ہی کی بولی ہے۔

۲۔ اوستا میں جو قدیم ترین جغرافیائی اشارات ملتے ہیں وہ سب کے سب مشرقی ایران ہی سے متعلق ہیں اور اوستا کے آخری حصوں کی زبان بھی "گاتاہا" کی زبان کی ہی طرح ایران کے مشرقی حصے کی زبان ہے۔ لفظ "کوی" مشرقی ایران کا

---

[1] حماسہ سرائی۔ ص ۴۸۶

ایک لقب ہے اور اسی لقب سے ملقب زردشت کا ایک حامی ویشتاسپ ایران کے مشرقی حصے پر حکمران بھی تھا۔ یونانی مورخین کے نزدیک یہ لقب بالکل ہی غیر معروف اور مجہول ہے لیکن چونکہ یونانی مؤرخین نے ایران کے بارے میں جو کچھ بھی لکھا ہے وہ مغربی ایران میں رہنے والوں کی روایتوں کو بنیاد بنا کر لکھا ہے اس لئے قطعیت کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ اس لقب کا تعلق ایران کی مشرقی سرزمین سے نہیں تھا۔

۳۔ کیخسرو اور افراسیاب یا کوروش اور آستو آگس کی داستانوں میں جو مشابہتیں ہیں صرف انہی کو بنیاد بنا کر یہ فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ کیخسرو اور افراسیاب یا کوروش اور آستو آگس ایک دوسرے کے مماثل ہیں۔ اور یہ افراد الگ الگ شخصیتوں کے حامل نہیں ہیں۔ اسی طرح کیانی اور ہخامنشی بادشاہوں کے ناموں اور کارناموں میں جو مماثلتیں ملتی ہیں وہ بھی اس بات کا مکمل ثبوت نہیں ہیں کہ یہ دونوں شاہی سلسلے دو الگ الگ سلسلے نہیں بلکہ ایک ہی ہیں۔

۴۔ وہ حضرات جو ہخامنشیوں اور کیانیوں کو ایک ہی سلسلے کے افراد سمجھتے ہیں ان کے نزدیک اس سلسلے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ داریوشِ اول کا باپ ویشتاسپ اور زردشت کا حامی "کی گشتاسپ" ایک ہی شخصیت کے دو نام ہیں "کی گشتاسپ" کے بارے میں اوستا کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ زردشت اور زردشتی مذہب کا زبردست حامی، موید اور مددگار تھا لیکن ہمارے پاس اس بات کی کوئی دلیل نہیں ہے کہ ہم اس "کی گشتاسپ" کو داریوش اول کا باپ، ویشتاسپ قرار دے سکیں۔ صرف تخمین وظن سے کام لے کر ان دونوں شخصیتوں کو ایک ہی شخصیت قرار دیا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ظن وتخمین کو کسی بھی تاریخی وقوعے کے اثبات کی بنیاد نہیں بنایا جا سکتا۔

۵۔ مشہور فرانسیسی مستشرق بنونیسٹ Benevniste نے اپنی کتاب

Persian religion according to the Chief Greek texts

میں یونانی مؤرخین کی تحریروں اور کتبوں سے جواب دریافت ہو چکے ہیں، یہ ثابت کر دیا ہے کہ ہخامنشی خاندان زردشتی مذہب کا پیرو نہیں تھا بلکہ اپنے

قدیم آریائی مذہب کا پابند تھا۔ اس مسلمہ ثبوت کی موجودگی میں کی گشتاسپ اور داریوش اول کے باپ ویشتاسپ کو ایک ہی شخصیت قرار دینا کسی بھی طرح ممکن نہیں ہے۔

اِن تمام نکات کو مدِنظر رکھتے ہوئے ڈاکٹر صفا اس بات کے قائل ہیں کہ پیش دادی اور کیانی سلسلۂ سلاطین حقیقی اور تاریخی خاندان تھا اور قدیم ایران کی تاریخ مرتب کرتے وقت ان دونوں خاندانوں کے ذکر سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ اسی سلسلۂ سخن میں ڈاکٹر نے لفظ "کی" (کے) کے سلسلے میں بھی تحقیق کی ہے اور اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اس لفظ کے معنی شہنشاہِ مطلق کے تھے۔ جس کو فردوسی نے بھی اپنے شاہ نامہ میں اسی معنی میں استعمال کیا ہے۔ کیانیوں کا ذکر کرتے وقت یہ ممکن نہیں ہے کہ فرِ کیانی کا ذکر نہ کیا جائے اسی لیے ڈاکٹر صفا نے فرِکیانی کا بھی خاصہ مفصل ذکر کیا ہے اور مختلف ماخذ کے ذریعہ اس کے بارے میں موجود غلط فہمی کے ازالہ کی بھی کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر صفا کے نزدیک پیش دادیوں اور کیانیوں کے تاریخی اور واقعی سلسلۂ سلاطین ہونے کے جو ثبوت تھے وہ ہم نے مختصر طور پر اپنی زبان میں نقل کر دیے ہیں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے اوستا، پہلوی کتابوں اور ظہور اسلام کے بعد کی تاریخی کتابوں سے جو مدد لی ہے طوالت کے خوف سے ہم نے ان کا حوالہ دینے سے گریز کیا ہے۔ ممکن ہے کہ کچھ حضرات کو ڈاکٹر صفا کے خیالات سے اتفاق نہ ہو لیکن ایسے حضرات بھی ان کی محنت، دیدہ ریزی اور تطبیقِ مسائل کی داد دیے بغیر نہ رہ سکیں گے۔

"حماسہ سرائی در ایران" کا جائزہ ختم کرنے سے پہلے ہم ایک اور دلچسپ موضوع کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں۔ ڈاکٹر صفا نے اس کتاب کے آخر میں ایک باب دشمنانِ ایران کے عنوان سے بھی سپردِ قلم کیا ہے، جس میں دیووں، تورانیوں، رومیوں اور عربوں کے کرداروں پر بحث کرتے ہوئے ڈاکٹر صفا نے منثور و منظوم شاہ ناموں کی ان روایتوں کا ناقدانہ جائزہ لینے کی کوشش کی ہے جن میں اِن دشمنانِ ایران کا خاص طور سے تذکرہ کیا گیا ہے۔ ہم تورانیوں، رومیوں اور عربوں سے صرف نظر کرتے ہوئے صرف اس حصے کے

مندرجات سے بحث کرتے ہیں جو دیووں سے متعلق ہے۔

بقول ڈاکٹر صفا ایران کی ملّی اور حماسی روایتوں میں ظہور گیومرث سے لے کر گشتاسپ کے زمانے تک برابر ان دیووں کا ذکر ملتا ہے جو ایرانیوں کے قدیم ترین دشمن تھے۔ ایرانیوں کی دیووں سے یہ کشاکش و کشمکش تورانیوں سے نبرد آزما ہونے سے قبل ہی شروع ہو چکی تھی اور جس زمانے میں ایرانی اور تورانی ایک دوسرے سے باہم دست و گریباں تھے اس زمانے میں بھی دیووں اور ایرانیوں کی کشمکش اپنی جگہ پر پہلے ہی کی طرح باقی تھی۔

ایران کی ملّی روایات کے بموجب ایران پر دیووں کا سب سے پہلا حملہ اہریمن کی طرف سے ہوا تھا۔ اس جنگ میں اہریمن نے اپنے لڑکے کو گیومرث سے جنگ کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ یہ وہی جنگ ہے جس میں گیومرث کا لڑکا سیامک اپنے دشمنوں سے جنگ کرتا ہوا مارا گیا تھا۔ شاہنامہ فردوسی میں یہ واقعہ ان الفاظ میں نقل ہوا ہے۔

برشک اندر اہریمن بدسگال — ہمی رائے زد تا بیاگند بال
یکے بچہ بودش چو گرگ سترگ — دلاور شدہ با سپاہِ بزرگ
سپہ کرد و نزدیک او راہ جُست — ہمی تخت و دیہیم گر شاہ جُست
سیامک بیامد برہنہ تنا — برآویخت با پور اہرمنا
بزد چنگِ وارونہ دیو سیاہ — دوتا اندر آورد بالائے شاہ[1]

ڈاکٹر صفا نے ان اشعار پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان اشعار سے یہی مطلب نکلتا ہے کہ دیووں کا تعلق اہریمن سے تھا لیکن اسی حقیقت سے اس بات کا بھی اثبات ہوتا ہے کہ انسانوں اور دیووں کے درمیان کچھ زیادہ فرق نہیں تھا۔ انسان اور دیو دونوں ہی جنگ کے یکساں طور وطریق سے واقفیت رکھتے تھے اور دونوں گروہوں کی صرف یہی کوشش تھی کہ جہانداری و بادشاہی ان کو حاصل ہو جائے۔ اس سلسلہ میں یہاں ڈاکٹر صفا کا ایک اقتباس نقل کر دینا نامناسب نہ ہوگا جس میں انھوں نے اس مسئلہ کی مزید

---

[1] حماسہ سرائی۔۔۔ ص ۴۰۱

عقدہ کشائی کی ہے:

"ہرچہ شاہ نامہ و دیگر منظومہ ہائے حماسی بیشتر مطالعہ کنیم صفاتِ انسانی دیوان را بیشتر می یابیم و حتیٰ در بعض مواقع بدیں نتیجہ می رسیم کہ تمدن و ہنر و دانش ایشاں از آدمیان بیشتر است چنانچہ خط را بہ تہمورث آموختند و بفرمانِ جمشید خانہ ہا ساختند وحتیٰ در گرشاسپ نامۂ اسدی آنجا کہ از جزیرۂ دیو مردمان سخن می رود بسیاری از خصائص زندگی شہر نشینی و مدنی بدانان نسبت دادہ شدہ است و تنہا عنصر افسانہ ئی کہ دریں روایت راہ یافتہ آنست کہ دندانِ پیشین ایں دیوان مانند دندان گراز بود و شاید ایں تخیل نتیجۂ تشبیہ آنان در دلاوری بگراز باشد چہ در ادبیات پہلوی ایں تشبیہ عمومیت داشت[1]۔"

شاہ نامہ اور دوسری رزمیہ منظومات کا ہم جتنا زیادہ مطالعہ کرتے ہیں اتنا ہی زیادہ دیووں میں انسانی صفات کی موجودگی ہم پر ظاہر ہوتی ہے یہاں تک کہ ہم بعض مواقع پر اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ان دیووں میں ہنر، تمدن اور علم و دانش انسانوں سے زیادہ ہے چنانچہ رسم الخط کو ان لوگوں نے تہمورث سے سیکھا، جمشید کے حکم سے مکانات بنائے۔ حتیٰ کہ اسدی کے گرشاسپ نامہ میں جہاں دیووں کے جزیرہ کا ذکر کیا گیا ہے وہاں پر زندگی کے ان خصائص کا خاصا ذکر موجود ہے جو شہروں میں بسنے اور متمدن ہونے کے بعد حاصل ہوتے ہیں۔ اس روایت میں جو ایک افسانوی عنصر داخل ہو گیا ہے وہ یہ ہے کہ ان دیووں کے اگلے دانت سوروں کے دانتوں کی طرح تھے۔ شاید اس تشبیہ کی وجہ یہ ہو کہ وہ لوگ سوروں کی طرح بہادر رہے ہوں کیونکہ پہلوی ادبیات میں بہادری کے لیے یہ تشبیہ بہت ہی عام ہے

---

[1] بحوالہ سابق ص ۱۰۶

اسی سلسلۂ سخن میں ڈاکٹر صفا نے یہ بھی لکھا ہے کہ اہرمنی دیووں کے بعد پھر شاہ نامۂ فردوسی میں مازندرانی دیووں کا قصہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہ مازندرانی دیو بھی اہرمنی دیووں کی طرح نہ تو تمدن سے بے بہرہ تھے اور نہ ہی جنگجوئی اور جنگی چالوں سے ناواقف تھے۔ شاہ نامۂ فردوسی سے اپنی بات کا اثبات کرنے کے بعد ڈاکٹر صفا نے جو نتیجہ برآمد کیا ہے وہ انہی کے الفاظ میں درج ذیل ہے:

"از قرائن زیادی کہ در دست است و بعض آنہا فوقاً ذکر شد چنیں برمی آید کہ دیوان در روایت ملی ایرانیان دستۂ ئی از آدمیان بودند و چون ہمہ جا از ایشان بنیرو وپہلوانی یاد شدہ معلوم می شود کہ مردم تناور و برومند و از نژادِ قوی بودہ و چوں با ایرانیان بر سر مساکنِ خویش جنگ می کردند میتواں گفت کہ از نژادی دیگر و پیش از ایرانیان در سرزمین ایران یا نواحی خاصی از آں مثلاً مازندران و گیلان ساکن بودہ اند[1]"

بہت سے قرائن جن تک ہماری دسترس ہے اور جن میں سے بعض اوپر درج بھی ہو چکے ہیں ان کے ذریعے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ایران کی ملی روایتوں میں جن دیووں کا ذکر ہوا ہے وہ انسانوں کا گروہ تھا اور چونکہ ہر جگہ ان کی قوت، طاقت اور پہلوانی کا ذکر کیا گیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ لمبے تڑنگے ہٹے کٹے اور قوی نسل کے افراد تھے اور چونکہ یہ لوگ اپنے مسکن کی سرحد پر ایرانیوں سے جنگ کرتے تھے اس لیے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ یہ لوگ ایک دوسری نسل سے تعلق رکھتے تھے اور ایرانیوں سے پہلے ایران کی سرزمین یا اسکے مخصوص علاقوں مثلاً مازندران اور گیلان میں بود و باش رکھتے تھے

ڈاکٹر صفا نے اس امر کی بھی وضاحت کی ہے کہ ایرانی مذہب جادو، ٹونے ٹوٹکے کا مخالف تھا اسی لیے شاہ نامہ میں سحر و جادو کے ذریعہ جتنے بھی وقوعات وقوع پذیر ہوئے ہیں وہ غیر ایرانیوں یا ان لوگوں کے ذریعہ عالم وجود میں آئے ہیں جو ایرانیوں کے مذہب کے پابند نہ تھے۔ ایران کی ملی اور رزمیہ روایتوں کی رو سے

---

[1] بحوالہ سابق ص ۴۴۰

ایرانیوں کے دشمن سحر و جادو سے کام لیتے تھے اور ایرانی ان چیزوں سے نابلد تھے۔ اِن روایتوں سے بہ آسانی یہ نتیجہ بھی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ایرانیوں کے دشمنوں کا مذہب ایرانیوں کے مذہب سے الگ تھا اور وہ غالباً مشرک اور بت پرست تھے ڈاکٹر صفا کا خیال ہے کہ یہ لوگ "مزدیسنا" کے نہیں بلکہ "دیویسنا" کے معتقد تھے اور غالباً اسی لیے ان لوگوں کو دیو کے نام سے موسوم کیا گیا۔

ایران کی ملی روایتوں اور شاہ ناموں میں دیووں کی جو تصویر کشی کی گئی ہے اس میں ان کے سروں پر دو سینگیں بھی دکھلائی گئی ہیں دیووں کی اِن سینگوں کی اصلیت وحقیقت کیا ہے اس پر ڈاکٹر صفا نے ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے۔

"بگمانِ من علت آنکہ در روایاتِ ملی ایران برائے دیوان شاخ و دُم تصور می کردند ایں بودہ است کہ دیوان بنا بر آنچہ بصراحت از شاہنامہ برمی آید پوست حیوانات بتن می کردند مثلاً اکوان دیو پوستِ گور بر تن داشت و در سایر موارد ہم از "چرم" دیوان یعنی لباسِ چرمین کہ از پوست دد و دام تہیہ می شد سخن رفتہ است وچنیں می نماید کہ ایں بومیانِ ایران در تمدن از قوم آریا فرو تر بودند و ہنوز از بافتن و دوختن آگہی نداشتند۔[1]"

میرے خیال میں ایران کی ملی روایتوں میں دیووں کے لیے سینگ اور دُم کا جو تصور ہے اس کی وجہ شاہ نامہ کی صراحت کی روشنی میں یہ ہے کہ یہ لوگ جانوروں کے چمڑوں کا لباس پہنتے تھے مثلاً اکوان دیو گورخر کا چمڑہ پہنتا تھا۔ اس کے علاوہ بھی دیگر تمام مواقع پر دیووں کے چمڑے کے لباسوں کا ذکر موجود ہے جو کہ درندوں اور چرندوں کے چمڑے سے بنائے جاتے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایران کے یہ باسی تمدن کے لحاظ سے آریوں سے فروتر تھے اور بُنائی اور سلائی کے فن سے اس وقت تک آگاہ نہ ہوئے تھے۔

اس سلسلہ میں ڈاکٹر صفا نے ایران کی قدیم ترین تاریخ کے اوراق پلٹتے ہوئے اپنے قارئین کو یاد دلایا ہے کہ جب آریا قوم اپنے اصلی مسکن سے کوچ کر کے

---

[1] بحوالہ سابق ص ۴۰۵

ایران پہنچی تو اس کو وہاں کی مقامی آبادی دیو یسنا سے بہت سخت جنگیں کرنی پڑیں۔ دیو یسنا قوم، کھال پہننے والی، نیم وحشی، نیم متمدن قوم تھی لیکن ہمت، بہادری، زور اور تن آوری میں آریا قوم سے کہیں آگے تھی۔ آریا اور دیو یسنا قومیں مدت دراز تک ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہیں اور دیو یسنا کے ہاتھوں آریا قوم کو سخت نقصان پہنچتے رہے۔ ڈاکٹر صفا کا خیال ہے کہ ان ہی سخت نقصانات کی وجہ سے آریا روایتوں میں جب بھی دیو یسنا کا ذکر آتا ہے تو اس ذکر میں بلا کی شدت اور تلخی ہوتی ہے جس کے پس پردہ وہ خوف و ہراس بھی دیکھا جاسکتا ہے جو آریا قوم کے دلوں میں دیو یسنا کی تن آوری اور زورمندی کی وجہ سے جاگزین ہوگیا تھا۔ آریا قوم کے وہ بادشاہ یا جواں مرد جو دیو یسنا قوم کے کسی فرد پر غالب رہے اور اس کو قتل کرنے میں بھی کامیاب رہے آریا روایتوں اور حکایتوں میں ان کا ذکر بڑے فخر و مباہات سے کیا گیا ہے اور ان کے کارناموں کو مثل بنا لیا گیا ہے۔ مثلاً ہوشنگ، تہمورث جمشید، گرشاسپ اور سام و رستم کے نام اسی وجہ سے خاص طور سے عزت و احترام کے ساتھ لیے جاتے ہیں کہ یہ افراد دیو یسنا پر غالب آئے تھے۔

اس انکشاف کے بعد ڈاکٹر صفا ماضی کی تاریخ کے اوراق پر اوراق پلٹتے چلے گئے ہیں اور انھوں نے دیووں سے متعلق ادستائی، تاریخی اور افسانوی تمام روایتوں کو جمع کر دیا ہے۔ اس تمام بحث کا لب لباب مختصر الفاظ میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ شاہ ناموں میں جن مافوق الفطرت ہستیوں کا ذکر بار بار آیا ہے وہ اصلاً مافوق الفطرت ہستیاں نہیں تھیں بلکہ آریا قوم کی دشمن تھیں جنھوں نے اپنی تن آوری اور زورمندی کی وجہ سے آریا قوم کو تنگ کر رکھا تھا۔ آریا جب ایسے شدید دشمنوں پر غالب آئے تو انھوں نے اپنی جواں مردی اور بہادری کا سکہ جمانے کے لیے اپنے دشمنوں کو بعض ان صفات سے بھی متصف کر دیا جن کا سرے سے کوئی وجود نہیں تھا یہ انسانی فطرت ہے کہ برابر کے دشمن کو مار لینے پر اس کو کوئی خاص فخر یا غرور نہیں ہوتا لیکن اگر دشمن زبردست اور زور آور ہو اور اس پر فتح حاصل ہو جائے تو انسانی فطرت اپنی برتری جتانے کے لیے دشمن کے اوصاف کو بھی مبالغہ کے ساتھ بیان کرتی ہے تاکہ خود اس کی زور آوری، ہمت

اور بہادری کا سکہ لوگوں کے دلوں میں بیٹھ جائے۔ آریا قوم نے بھی اپنے دشمنوں کے ذکر میں اسی بات کو ملحوظ رکھا ہے اسی لیے شاہ ناموں میں ایرانیوں کے دشمن مافوق الفطرت ہستیاں بن گئے ہیں۔

اس پورے باب میں ڈاکٹر نے جس محققانہ دیدہ ریزی سے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے وہ انہی کا حصہ ہے ان کا یہ نکتہ اتنا اہم اور قابلِ توجہ ہے کہ اگر اس پر مزید تحقیق و تفتیش کی راہیں کھل جائیں تو ممکن ہے کہ بہت سے وہ تاریخی حقائق جو پردۂ خفا میں ہیں بے نقاب ہو کر سامنے آجائیں۔

ہم نے اب تک جو کچھ نقل کیا ہے اس کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اگر یہ کہا جائے کہ "حماسہ سرائی در ایران" کو لکھ کر ڈاکٹر صفا نے تاریخ و ادب کے بہت سے گوشوں پر مزید تحقیق کی ضرورت کا احساس دلایا ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ تحقیق کا کام صرف مسائل کو حل کر دینا ہی نہیں ہے بلکہ بہت سے مسائل کا احساس دلانا بھی ہے اس لحاظ سے ڈاکٹر صفا کی یہ کاوش اپنی جگہ پر کامیاب ترین کاوش قرار دی جا سکتی ہے جس میں مسائل کو صرف حل ہی نہیں کیا گیا ہے بلکہ بہت سے مسائل کو ابھار کر ان پر مزید تحقیق کی ضرورت کا احساس بھی دلایا گیا ہے۔

کبیر احمد جائسی (علیگ)

تاریخِ ادبیات در ایران" ایک جائزہ

ڈاکٹر صفا کے قلم سے تاریخ ادبیات ایران کے موضوع پر اب تک جو تحقیقی اور علمی کارنامے انجام پا چکے ہیں ان سب کا نچوڑ اوران کی پوری زندگی کا حاصل مطالعہ "تاریخ ادبیات در ایران" کی تین ضخیم جلدوں کی صورت میں دیکھا جاسکتا ہے جو تقریباً پونے دو ہزار صفحات پر مشتمل ہیں۔ ڈاکٹر صفا کی مذکورہ تاریخ ادبیات ابھی مکمل نہیں ہوئی ہے اور اس کی مزید جلدیں شائع ہونے والی ہیں ان بقیہ جلدوں کے شائع ہو جانے کے بعد ہی ان کے اس کام کا صحیح طور سے جائزہ لیا جا سکتا ہے اور اس کی قدر وقیمت کی تعیین بھی کی جاسکتی ہے۔ سردست اس کام کے صرف ان حصوں پر ایک سرسری نظر ڈالنے کی کوشش کی جارہی ہے جو اب تک چھپ کر منظر عام پر آچکے ہیں۔

قبل اس کے کہ ہم ڈاکٹر صفا کی تاریخ ادبیات نویسی کا جائزہ لیں اور یہ دیکھنے کی کوشش کریں کہ انھوں نے اس موضوع پر جو کچھ لکھا ہے اس کی قدر وقیمت کیا ہے بہتر یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے اس بات کا جائزہ لیتے چلیں کہ ڈاکٹر صفا کے نزدیک تاریخِ ادبیات نویسی کے اصول کیا کیا ہیں اور وہ کسی قوم، ملک یا زبان کی تاریخ ادبیات مرتب کرتے وقت کن کن چیزوں کو پیش نظر رکھنا ضروری سمجھتے ہیں تاکہ خود انہی کے وضع کردہ اصول وضوابط کو بنیاد بنا کر اس بات کا فیصلہ کیا جاسکے کہ وہ اپنی کد و کاوش میں کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر صفا کا خیال ہے کہ کسی قوم کی تاریخِ ادبیات کو دو طرح سے مرتب و منظم کر کے اس کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ ایک طریقہ تو یہ ہے کہ کسی قوم

کے تمام ادبی کارناموں کی توضیح کرتے ہوئے شرح و بسط کے ساتھ ان تمام عوامل کی بھی نشاندہی کردی جائے جو علوم و فنون اور زبان و ادب کی پیشرفت کا سبب بنے ہیں۔ مذکورہ عوامل کے عہد بہ عہد تغیر و تبدل اور اسی تغیر و تبدل کے نتیجے میں زبان و ادب کی پیش رفت کا مطالعہ کرتے ہوئے اس قوم کی ادبی تاریخ مرتب کی جاسکتی ہے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ شعر کی اصلی اور اساسی نوعیت پر بحث کرتے ہوئے اس کے مختلف سبک Style کی بھی نشان دہی کی جائے اور اس قوم کی ادبیات کے مختلف اور گوناگوں گوشوں کا احاطہ کرتے ہوئے ایک مفصل تاریخ ادب مرتب کرلی جائے۔ ثانی الذکر طریقے سے فارسی میں بہت سی کتابیں لکھی جاچکی ہیں جن میں دو کتابوں کا ذکر ناگزیر ہے، پہلی کتاب ملک الشعرا بہار مرحوم کی سبک شناسی ہے جو تین ضخیم جلدوں میں لکھی گئی ہے۔ دوسری کتاب خود ڈاکٹر صفا کی ضخیم ترین تصنیف "حماسہ سرائی در ایران" ہے۔ چونکہ ڈاکٹر صفا ثانی الذکر طریقے سے ایک صنف سخن کی تاریخ مرتب کرچکے تھے اس لیے انھوں نے تاریخ ادبیاتِ ایران کو مرتب کرنے کے لیے پہلے طریقے کا انتخاب کیا ہے۔ خود انھوں نے اپنے طریقۂ کار کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے۔

• روش تحقیق نگارنده در این کتاب آنست که پیش از ورود در مطالعۂ وضع ادبی ہر عہد، نخست مقدمات آشنائی با محیط فکری و سیر افکار و عقائد و علوم را در آن دوره فراہم آورد زیرا بنظر حقیر ادب فنِ بیانِ عقائد و افکار و عواطف است و علوم ادبی نیز دانشہائے است کہ ایں مقصود را بہتر می رساند۔

اس کتاب میں میری تحقیق کی روش یہ ہے کہ ہر عہد کے ادبی صورتِ حال کے مطالعہ سے پہلے اس عہد کے فکری ماحول، خیالات، عقائد اور علوم کا جائزہ لے لوں، کیونکہ میرے نزدیک عقائد، افکار اور اعلیٰ انسانی جذبات کے بیان کے فن ہی کا نام ادبیات ہے۔ اور ادبی علوم بھی ایسے علوم جو اس مقصد تک پہنچنے میں ہماری بڑی مدد کرتے ہیں۔

عقائد وافکار و عواطف کہ موضوعِ نظم ونثرست، نیز بتمام معنی کلام تابعِ محیطِ مادی ومعنوی ہر عہدمی باشد و بہ ہیچ روی از آن مستقل و جدا نیست ایں نست کہ اگر فی المثل بخواہیم علل ترقی و انحطاط افکار و اشعار حماسی را در یک عہد بشناسیم باید حتماً وضع سیاسی و دینی و اجتماعی را در آن عہد کاملاً مورد مطالعہ قرار دہیم زیرا ایں اوضاعست کہ می تواند یک ملت را بجانب مفاخرت نژادی و بیانِ افتخارات باستانی و قہرمانی و ملی سوق دہد و یا از آں باز دارد[1]"

عقائد، افکار اور اعلیٰ انسانی جذبات جو کہ نظم و نثر کا موضوع ہیں، اپنے مادی اور معنوی عہد کے تابع ہوتے ہیں اور کسی بھی شکل میں اس سے جدا اور مختلف نہیں ہوتے، مثلاً اگر ہم یہ چاہیں کہ کسی عہد میں افکار اور رزمیہ اشعار کے ترقی و تنزل کے اسباب سے واقفیت حاصل کریں تو ہم کو چاہئے کہ ہم اس عہد کے سیاسی، مذہبی اور اجتماعی کوائف کو اپنے بھرپور مطالعہ کا ہدف بنائیں کیونکہ یہی وہ چیزیں ہیں جو کسی قوم کو اپنی نسل، گذشتہ زمانے (کے بزرگوں) کے کارناموں اور بہادری کے قصوں کو بیان کرنے پر آمادہ کرتی ہیں یا ان سے باز رکھتی ہیں۔

مندرجہ بالا اقتباس سے اس بات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر صفا اپنی اس کتاب کو کس انداز اور کس طریقے سے مرتب کرنا چاہتے ہیں اس اقتباس کا یہ جملہ بہت ہی اہم ہے کہ "میرے نزدیک ادب، عقائد، افکار اور عواطف کو بیان کرنے کا نام فن ہے" اس ایک جملہ سے اس بات کا پتہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ ادب کو کن کن اوصاف اور خصائص کا حامل سمجھتے ہیں اور اس کے پسِ پشت کن کن محرکات کو جلوہ فرما دیکھتے ہیں۔ ان کا یہ کہنا کہ عقائد، افکار و عواطف نظم و نثر کا موضوع ہوتے ہیں صرف یہی نہیں بلکہ وہ اپنے مادی اور معنوی ماحول کے شارح اور عکاس بھی ہوتے ہیں اس لیے ہم ادبیات کو اس کے زمانے کے مخصوص افکار، عقائد اور عواطف سے الگ کر کے اگر اس کا مطالعہ کریں تو ہم ادبیات کے ساتھ انصاف نہیں کریں گے اسی لیے انھوں نے تاریخِ ادبیات

---

[1] تاریخِ ادبیات در ایران، جلد اول، ص، یز

کو مرتب کرنے کے لیے اس طریقے کا انتخاب کیا ہے کہ تاریخ ادبیات کے پہلو بہ پہلو ہر ہر عہد کے افکار عقائد اور عواطف کی بھی تاریخ مرتب ہوتی جائے تاکہ ادب کو اس کے صحیح تناظر میں دیکھا جا سکے۔

ڈاکٹر صفا کے طریقۂ کار کے سلسلے میں ان کا ایک اور بیان بھی قابلِ توجہ ہے. جو انھیں کے الفاظ میں درج ذیل ہے۔

" موضوعِ دیگری کہ باید مورد توجہ باشد آنست کہ ادبیات را اگر بمعنی اعم آن مورد مطالعہ قرار دہیم و از جنبۂ خاص آن صرف نظر کنیم باید ہمہ آثارِ فکری یک ملت را بہ ہر لہجہ و زبان و در ہر موضوع و مطلبی باشد در نظر بگیریم۔ بہ این ترتیب ادبیات یک ملت در ادوار گذشتہ از شعر و نثر ادبی تجاوز می کند و ہمہ انواع آثار فنی و علمی و عرفانی و فلسفی و دینی را نیز شامل می گردد و نیز آنچہ از آثار فکری یک ملت بزبان غیر از زبان متداول آن قوم وجود یافتہ است ہم در شمار آثارِ ادبی او در می آید۔ مثلاً ما وقتی در تاریخ ادبیات دورۂ اسلامی ایران تحقیق می کنیم تنہا باید از حال لہجاتِ مہم مکتوب ایرانی مانند پہلوی و سغدی و تخاری و خوارزمی و فارسی دری و کردی و طبری جز آنہا۔ و تمام آثاری کہ

دوسرا موضوع جس پر توجہ دینی چاہئے یہ ہے کہ اگر ہم ادبیات کو اس کے عمومی معنی میں اپنے مطالعہ کا ہدف قرار دیں، اور اسکی مخصوص ماہیت سے صرف نظر کر لیں (تب بھی) ہم کو چاہیے کہ ہم ایک قوم کے تمام فکری آثار پر نگاہ رکھیں خواہ وہ فکری آثار کسی بھی بولی یا زبان میں لکھے گئے ہوں، اور کسی بھی موضوع اور مطلب پر مشتمل ہوں۔ اس لحاظ سے ایک قوم یا ملت کا گذشتہ زمانہ کا ادب، شعر اور نثر کے (دائرہ سے) متجاوز ہو کر ہر قسم کے فنی، علمی، عرفانی، مذہبی اور فلسفیانہ آثار پر محیط ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ کسی قوم کے وہ فکری آثار جو اس کی متداول زبان میں نہیں بلکہ کسی غیر زبان میں عالم وجود میں آئے ہیں، وہ فکری آثار بھی اسی قوم کے ادبی آثار میں شمار کیے جاتے ہیں مثلاً ہم جس وقت ایران کے اسلامی عہد کی تاریخ ادبیات پر تحقیق کرتے ہیں (اسوقت) صرف یہی کافی نہیں کہ ایران کی لکھی جانے والی اہم بولیاں مثلاً پہلوی، سغدی، تخاری، خوارزمی، فارسی، دری، کردی، طبری وغیرہ اور ان تمام (ادبی)

به آں لهجات پدید آمده است مطلع شویم
بلکه باید از وضعِ زبانِ عربی دریں
کشور و آثاری که از نویسندگان و شاعران
ایرانی بزبانِ عربی پدید آمده است،
نیز خبر یابیم چه ایں ها هم آثار اندیشه و
ذوق ایرانی و جلواتی از جلوه هائے
فکریٔ ایں قوم است منتهی بزبان قومی
دیگر، و هم چنیں است از زبان و شعر
و نثر ترکی در قرون متاخر که عدهٔ از
نویسندگان و گویندگان آں ایرانی
نژاد یا ساکنِ ایران بوده اند دریں
مقدمات علت ورودِ مادر مباحث
سیاسی و دینی و علمی (اعم از علوم عقلی و
دینی) و ذکر علمار بزرگ و آثار آنان
و ثبت نام شاعران و نویسندگان
تازی گوی ایران که ممکن است
در بادی امر خارج از موضوع بنظر آید،
معلوم می گردد[1]"

آثار سے جو ان بولیوں میں عالم وجود میں آئے
ہیں، واقف ہوں، بلکہ اسی کے ساتھ ساتھ
یہ بھی ضروری ہے کہ ہم اس ملک میں عربی زبان کے
چلن اور ایرانی نثر نگاروں اور شاعروں نے عربی
زبان میں جو کچھ بھی اپنی یادگار چھوڑا ہے، اس سے
بھی آگاہ ہوں۔ کیونکہ یہ ادبی آثار بھی ایرانی
قوم کے فکر کے (عکاس) اور اس کے ذوق کے
جلووں میں سے ایک جلوہ ہیں جو کسی دوسری قوم
کی زبان میں پیش کیے گئے ہیں۔ بعینہ یہی حال آخیر
کی صدیوں میں ترکی زبان اور نظم و نثر کا بھی ہے
جب کہ اس زبان کے شاعروں اور نثر نگاروں
کی ایک بڑی تعداد یا تو ایرانی النسل ادبار اور
شعرار پر مشتمل تھی یا ان لوگوں پر جو ایران میں
آباد تھے۔ ان نکات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے
کہ ہم نے سیاسی، مذہبی اور علمی مباحث کے میدان میں
کیوں قدم رکھا ہے اور (اسی ضمن میں) ان بڑے بڑے
علمار، شعرار اور نثر نگاروں کے آثار پر بھی کیوں نظر ڈالی ہے
جو ممکن ہے کہ بادی النظر میں ہمارے موضوع سے خارج معلوم ہوتے ہوں

درج بالا اقتباس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صفا تاریخ ادبیاتِ ایران کا مطالعہ اس طرح کرنا چاہتے ہیں کہ ایران کے ہر عہد اور ہر "لہجہ" کے "فکری آثار" کو سامنے رکھ کر اس عہد کے ماحول کی روشنی میں اس کی ادبی قدر و قیمت کو معلوم کریں ایران جیسے ملک کی تاریخ ادبیات کے مطالعہ کے لیے صرف یہی بات کافی نہیں ہے کہ صرف ایرانی زبان اور اس کے مختلف لہجوں کے فکری آثار کو اپنے مطالعہ کا محور

---

[1] بحوالہ سابق، ص یز-یح

ہنلائے بلکہ یہ بات بھی از حد ضروری ہے کہ ایرانیوں نے غیر ایرانی زبان یا زبانوں میں جو سرمایہ یادگار چھوڑا ہے ان کا ژرف نگاہی اور غور و فکر کے ساتھ مطالعہ کر کے اس زمانے کے ایرانی ذہن اس کے سوچنے سمجھنے اور عمل کرنے کے مختلف اندازوں کو بھی واضح اور آشکار کر دیا جائے تاکہ اس بات کو سمجھنے میں آسانی ہو کہ ایران کے ایک عہد کا ادب دوسرے عہد کے ادب سے مختلف اور جداگانہ کیوں ہے۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا غالباً وہ پہلے ایرانی دانشمند ہیں جنھوں نے عربی اور ترکی زبانوں کے اس ادب کے مطالعہ پر خاص طور سے زور دیا ہے جو ایران میں یا ایران سے باہر ایرانی ادیبوں اور شاعروں کی سعی سے عالم وجود میں آیا ہے۔ وہ عربی اور ترکی ادب جس کے خالق ایرانی ادبا، اور شعرا ہیں اگرچہ غیر ایرانی زبانوں میں پیش کیا گیا ہے لیکن اس ادب میں جو فکر، احساس اور جذبہ کارفرما ہے وہ خالص ایرانی ہے۔ اسی لیے تاریخِ ادبیاتِ ایران سے بحث کرتے وقت ایرانی فکر کے اس عظیم الشان سرمائے سے صرف نظر کر کے تاریخ ادبیاتِ ایران کو پوری طرح سے مرتب نہیں کیا جا سکتا۔ اگر تاریخِ ادبیاتِ ایران کو مرتب کرتے وقت ایرانیوں کے غیر ایرانی زبانوں میں لکھے جانے والے ادب سے صرف نظر کر لیا جاتا ہے تو ایرانی فکر و احساس کا ایک گوشہ نگاہوں سے پوشیدہ رہے گا اور جو تاریخ ادبیات عالمِ وجود میں آئے گی وہ پورے ایرانی سرمایۂ ادب کا احاطہ نہ کر سکے گی بلکہ یک رخی ہوگی۔

ابھی تک جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس کی مزید وضاحت کے لیے ڈاکٹر صفا کا ایک اور اقتباس پیش کیا جاتا ہے تاکہ ان کا تاریخ ادبیات نویسی کا نظریہ پوری طرح ہمارے سامنے واضح ہو کر آجائے اور آگے چل کر ہم اس قابل ہو سکیں کہ خود انھیں کے وضع کردہ اصول و ضوابط کی روشنی میں ان کی اس تصنیف کا جائزہ لے سکیں۔

"پیداست کہ در ذیل ہر یک از مباحث و بعد از فراغ از بیان کیفیت سیر علوم و ادبیات در ہر یک از ادوار، بیانِ حالی از رجالِ مشہور

ظاہر ہے کہ ہر بحث کے ضمن میں اور ہر دور کے علوم و ادبیات کے سیر کی کیفیت بیان کرنے کے بعد اس دور کے ہر نوع کے بڑے بڑے لوگوں کا بھی ذکر ہوا ہے۔ اسکی

در هر رشته ئی نیز شده است و این از آن سبب است که رجال علم و ادب خود مولود وضع محیط اند لامحاله در ایجاد محیط خاصی بعد از خود موثر اند و بعبارت دیگر بهمان نحو که محیط ایجاد نابغه می کند نابغه نیز محیطی متناسب با عمال خود بوجود می آورد که به تناسب قدرت و اثر وجودی او امتداد می یابد۔ مثلاً بهمان نحو که محیط واجتماعی وسیاسی ایران در قرنِ سوم وچهارم منتهی بظهور حماسه گویانِ ملی علی الخصوص شاعر بزرگ ما استاد ابوالقاسم فردوسی شده است، او خود نیز منشار ایجاد یک محیط خاص ادبی در عالم حماسه سرائی گردیده است که هزار سال از آن می گذرد و هنوز ادامه دارد وهمیں حال را می توان در نوابغی از قبیل نظامی و مولوی و سعدی و حافظ مشاهده کرد پس بیانِ احوال و آثار هر شاعر یا نویسنده تا آنجا که در دسترس است بهمان اندازه در تاریخِ ادبیات لازم است که ذکر مقدماتِ ظهور آنان، از این جاست که ما کوشیده ایم

وجہ یہ ہے کہ اصحابِ علم و ادب جو کہ خود اپنے ماحول کی پیداوار ہیں ناگزیر طور پر اپنے بعد ایک مخصوص ماحول کی آفرینش میں بھی مؤثر ہوتے ہیں۔ بالفاظ دیگر اسی طرح جس طرح ماحول کسی عبقری کو جنم دیتا ہے ایک عبقری بھی اپنے اعمال کے ذریعہ ایک متناسب ماحول کی آفرینش کرتا ہے (اور یہ ماحول) اس کی توانائی کے تناسب اور وجود کے اثر سے توسیع پاتا ہے۔ مثال کے طور پر اسی طرح، جس طرح کہ تیسری اور چوتھی صدی کے ایران کا اجتماعی اور سیاسی ماحول، ملّی رزمیہ نگاروں بالخصوص ہمارے عظیم ملّی رزمیہ نگار ابوالقاسم فردوسی کے ظہور پر منتہی ہوتا ہے، فردوسی بھی رزمیہ نگاری کے میدان میں ایک مخصوص ادبی ماحول کا جنم داتا بنتا ہے (وہ ادبی ماحول) جس کی ابتدار کو ایک ہزار سال ہو چکے ہیں (لیکن) وہ آج بھی جاری و ساری ہے۔ یہی بات نظامی، مولانا روم، سعدی اور حافظ کے سلسلے میں بھی مشاہدہ کیا جاسکتا ہے اس لیے ہر شاعر یا ادیب کے کوائف زندگانی اور آثار کو اس حد تک بیان کیا گیا ہے جس حد تک (اس موضوع پر) ہماری دسترس ہے اور جس حد تک تاریخ ادبیات میں ان کا ذکر ضروری ہے تاکہ

ہر جا کہ لازم است سخن از رجال بزرگ علم و ادب رود و احوال و افکار و آثارِ آنان چنداں کہ در مقدرت و امکان ماست شناسانده شود۔[1]

ان کے عالم وجود میں آنے کے اسباب سامنے آجائیں۔ اسی لیے ہم نے کوشش کی ہے کہ جہاں پر بھی ضروری ہو اہلِ علم و ادب کا ذکر کردیا جائے اور جس حد تک ہمارے امکان میں ان کے زندگی کے حالات اور ان کے آثار سے روشناس کرادیا جائے۔

عقائد افکار اور بلند انسانی جذبات کے مطالعے اور ان کے محرکات کی نشان دہی کے بعد ڈاکٹر صفا اس بات کی بھی ضرورت محسوس کرتے ہیں کہ ہر ہر دور کے مشہور و معروف ادبار شعرار اور صاحبانِ علم و فن کا بھی انفرادی طور سے مطالعہ کیا جائے کیونکہ یہ مشہور و معروف شخصیتیں بھی اسی ماحول کی پروردہ ہیں جن کے عقائد، افکار اور عواطف کا مطالعہ کیا جاچکا ہے۔ ان شخصیتوں کا مطالعہ صرف اسی لیے ضروری نہیں ہے کہ وہ کسی مخصوص دور یا ماحول کی ترجمان ہیں بلکہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ ذہین اور غیر معمولی شخصیتیں اپنے مادی ماحول سے پرے ایک معنوی ماحول کی بھی تخلیق کرتی ہیں۔ اسی تخلیق ماحول کی بنا پر ان کا پیش کردہ ادب اپنے زمانے کی معروف اقدار سے کچھ انحراف بھی کرتا ہے اور کچھ نئی نئی چیزوں کو بھی شامل کرکے اپنی انفرادیت کو جلا دیتا ہے۔ اسی لیے ڈاکٹر صفا کا خیال ہے کہ کسی قوم کی تاریخ ادبیات مرتب کرتے وقت ایسی شخصیتوں کے کوائف حیات اور کارناموں سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔ انھوں نے تاریخِ ادبیاتِ ایران مرتب کرتے وقت جہاں ہر دور کے عقائد افکار اور عواطف کا جائزہ لے کر اس دور کی مخصوص خصوصیات کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے وہیں ہر ہر دور کے مشہور و معروف ادبار، شعرار کے کارناموں پر بھی شرح و بسط کے ساتھ نظر ڈالنے کی کوشش کی ہے تاکہ ان کی مرتب کردہ تاریخِ ادبیات ان کے پیش کردہ نقطۂ نظر کے مطابق ہوجائے اور وہ جس انداز سے تاریخِ ادبیات

---

[1] بحوالہ سابق ص یج

مرتب کرنا چاہتے ہیں اس کا ایک صحیح اور مکمل نمونہ لوگوں کے سامنے آجائے۔

ان چند بنیادی معروضات کے بعد اب ہم "تاریخِ ادبیات در ایران" کا ایک جائزہ لے کر اس بات کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ڈاکٹر صفا اپنی کدّ و کاوش میں کس حد تک کامیاب ہو سکے ہیں۔

تاریخ ادبیات در ایران کی پہلی جلد پہلی صدی ہجری سے لے کر پانچویں صدی ہجری کے آغاز تک کے زمانے پر محیط ہے۔ اس زمانے کے ابتدائی تین سو سال ایران کی تاریخ میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں کیونکہ یہ وہی دور ہے جب ان کی عظیم الشان سلطنت کا خاتمہ ہوا اور ان کی تہذیب، تمدن، زبان، ادب اور مذہب سب ہی کو دھکا پہنچا لیکن ایرانی قوم کے افراد اپنی عظمتِ گذشتہ کی بازیافت کے لیے عربوں کے خلاف مسلسل بغاوتیں کرتے رہے۔ ان میں سے کچھ بغاوتیں سیاسی اغراض و مقاصد کو سامنے رکھ کر کی جاتیں اور کچھ مذہبی بغاوتیں ہوتیں لیکن ہر قسم کی بغاوتوں کا منشا د مقصود ایک ہی تھا یعنی ایرانیوں کو عربوں کے تسلط سے نجات ملے۔ بغاوتوں کے علاوہ ایرانی قوم ادبی اور علمی میدان میں بھی ان تین سو برسوں میں برابر فاتح قوم یعنی عربوں سے نبرد آزما رہی اور زندگی کے ہر ہر میدان میں نہ صرف ان سے مقابلہ کرتی رہی بلکہ ان کو پیچھے ڈھکیلنے میں مصروف رہی۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ جب شعوبی تحریک آگ کی طرح پورے ایران میں پھیل گئی تو ایرانیوں نے فاتح قوم کی زبان میں مہارت بہم پہنچائی اور اپنے تمام جذبات و احساسات کو فاتح قوم کی زبان یعنی عربی زبان میں پیش کرنے لگے تاکہ فاتح قوم کے افراد کو اس بات کا اندازہ ہو سکے کہ مفتوح قوم کے لوگوں کے دلوں میں ان کے خلاف کس قسم کے جذبات موج زن ہیں۔ انہی وطن پرستانہ خیالات کو بنیاد بنا کر بہت سی نئی نئی مذہبی تحریکیں بھی عالمِ وجود میں آئیں جن کے پسِ پشت یہی جذبہ کارفرما تھا کہ ایرانی قوم کو غیروں کے دست برد سے نجات دلائی جائے۔ ان تمام مذہبی سیاسی اور اجتماعی تحریکوں کا لازمی اثر ایران کی ادبیات پر بھی پڑا اور یہ تحریکیں ایرانی ادب پر اپنا اَن مِٹ اثر چھوڑ گئیں۔ ڈاکٹر صفا نے سب سے پہلے ظہورِ اسلام سے لے کر تیسری صدی ہجری کے اختتام تک کی سیاسی

اجتماعی اور علمی تاریخ کتاب کے ۱۹۲ صفحات میں بیان کردی ہے تاکہ قاری کو اس ادب کے سمجھنے میں آسانی ہو جو اس عہد میں عالمِ وجود میں آیا ہے۔

ایران میں عربوں کے خلاف بغاوت کا سلسلہ حضرت علیؓ کے دورِ خلافت ہی سے شروع ہوگیا تھا، اس سلسلہ کی سب سے پہلی بغاوت جو ایران میں ۳۸ھ میں ہوئی تھی اگرچہ اس کا مرتکب ایک عرب خریت بن راشد الناجی تھا مگر اس کی مدد کے لیے بہت سے ایرانی بھی مجتمع ہوگئے تھے۔ یہ بغاوت ناکام رہی اور حضرت علیؓ کے فرستادہ ایک حاکم زیاد بن ابیہ نے فارس کو اپنے قابو میں کر کے اس فتنہ کو بیخ و بُن سے اکھاڑ پھینکا مگر یہ پہلی بغاوت زمین کے اندر ایسا زہر چھوڑ گئی جو تھوڑی تھوڑی مدت کے بعد سرزمینِ ایران کو مزید مسموم کرتی رہتی۔ اس عہد کے ادب کو سمجھنے کے لیے اِن بغاوتوں سے بھی صرفِ نظر نہیں کیا جاسکتا اس لیے ہم درج ذیل سطور میں ان کی طرف بھی مختصر اشارے کرتے چلتے ہیں۔

حضرت علیؓ کی خلافت کے بعد حضرت معاویہؓ کی خلافت کے ابتدائی زمانے میں ہرات میں بھی ایک بغاوت ہوئی مگر اس بغاوت کو جلد ہی ناکام بنادیا گیا۔ بقول ڈاکٹر صفا حضرت معاویہؓ کے زمانۂ خلافت سے لے کر عبدالملک کے زمانۂ حکومت تک مرکزی اور مشرقی ایران میں عربوں کے خلاف پیاپے بغاوتیں ہوتی رہیں۔ ان ہی بغاوتوں میں سے ایک بغاوت وہ بھی ہے جو ملکۂ بخارا نے "خاقانِ ترک" کی مدد لے کر کی تھی اور جس کو سلم بن زیاد نے فرو کیا تھا۔ موسیٰ بن عبداللہ بن خوارزم کی بغاوت بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جس نے ترمذ کی ولایت کو فتح کر لیا تھا اور کامل پندرہ سال تک اس ولایت پر حکمران بھی رہا تھا ان بغاوتوں کے علاوہ بنو ہاشم نے بنو امیہ کے خلاف جو بغاوتیں کیں ان میں سے بیشتر کا مرکز ایران ہی کی سرزمین تھی، مثال کے طور پر زید بن علی بن حسین نے ۱۲۱-۲۲ھ کے حدود میں کوفہ میں خروج کیا مگر قتل کر دیے گئے۔ ان کے قتل ہونے کے بعد بھی خراسان میں ان کے معتقدوں کی ایک بہت بڑی تعداد موجود رہی جو حکومتِ وقت کے خلاف لوگوں کو بھڑکاتی رہتی۔ اِسی طرح عبداللہ

بن معاویہ نے جو حضرت جعفر بن ابو طالب کے خانوادہ کے ایک فرد تھے، فارس اصفہان رے اور قم میں اپنے بہت سے طرف دار پیدا کر لیے تھے جو حکومتِ وقت کے لیے پریشانی کا سبب بنے رہے۔

ان مسلسل شورشوں اور پیاپے ایرانیوں اور عربوں کی بغاوتوں کی وجہ سے اموی حکومت دن بہ دن کمزور ہوتی چلی گئی۔ بنی امیہ کی کمزوری سے بنی عباس نے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور انھوں نے غیر عرب قوموں بالخصوص ان ایرانیوں سے پوری پوری مدد لی اور ان کو اپنے ساتھ بغاوت پر آمادہ کیا جن کو عرب حقارت کی نظر سے دیکھتے اور دوسرے درجے کے شہری کا سا سلوک ان کے ساتھ روا رکھتے بنی عباس کی اس دعوت پر خراسان کے لوگ ان کی حمایت کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے کیونکہ انھوں نے شروع ہی سے عربوں کے غلبہ کو نہ صرف ناپسند کیا تھا بلکہ ان کے خلاف بغاوتیں کرتے رہتے تھے اور نتیجہ کے طور پر ہر طرح کے ظلم و ستم برداشت کرتے تھے اس سلسلہ میں ابو مسلم خراسانی کا نام سب سے زیادہ اہم ہے جس نے عباسیوں کی حکومت کے قیام میں سب سے بڑا رول ادا کیا۔ ۱۳۲ھ میں بنی امیہ کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا اور ایرانیوں کی مدد سے ان کی جگہ پر بنی عباس کا پرچم لہرانے لگا۔

بنی عباس ہی کے زمانے میں ایرانیوں کا ایک دیرینہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوا ہارون الرشید کے انتقال کے بعد مامون اور امین کے درمیان تخت حکومت کے لیے جنگ ہوئی۔ مامون کی ماں چونکہ ایرانی تھی اس لیے ایرانی سرداروں نے اس کا ساتھ دیا، مامون کا سپہ سالار طاہر ذوالیمینین بھی ایرانی تھا۔ طاہر نے امین کی فوجوں سے جنگ کی اور ان پر فتح حاصل کی جس کے صلہ میں اس کو ۲۰۵ھ میں خراسان کی امارت دی گئی، طاہر نے اپنے تدبر اور ہوش مندی سے ایک نیم مختار ایرانی حکومت کی بنیاد رکھی جس کو عربوں کی فتح کے بعد کی سب سے پہلی ایرانی حکومت کہا جا سکتا ہے۔ تقریباً پچپن سال تک طاہر کے خاندان میں یہ حکومت قائم رہی جس کو یعقوب بن اللیث صفاری نے ۲۵۹ھ میں ختم کر کے صفاری حکومت کی بنیاد ڈالی۔

جس زمانے میں طاہر نے نیم مختار حکومت کی بنیاد ڈالی تھی اس زمانے میں

ایران کے دیگر مختلف حصوں میں اور بھی بغاوتیں ہو رہی تھیں۔ ان بغاوتوں میں سے بیشتر بغاوتیں اگرچہ ناکام بنادی گئیں مگر اس کا سب سے بڑا فائدہ ایرانیوں کو یہ ہوا کہ عربوں کی حکومت دن بہ دن کمزور ہونے لگی۔ ان بغاوتوں میں سے دو کا ذکر ڈاکٹر صفا نے خاص طور سے کیا ہے۔ جن کا ذکر مختصر طور سے یہاں کیا جا رہا ہے۔ ایک بغاوت ۲۰۱ھ میں آذربائجان میں ہوئی تھی، اس کا برپا کرنے والا بابک خرم دین نام کا ایک مزدکی تھا جس کو عربوں اور مسلمانوں سے سخت نفرت تھی اور اس کے پیرووں کے ہاتھوں لاکھوں مسلمان مار ڈالے گئے تھے۔ ۲۲۳ھ تک بابک خرم دین کی شورش برقرار رہی۔ سنہ مذکور میں معتصم کے ایک ایرانی سردار افشین کے ہاتھوں اس کا خاتمہ ہوا۔

دوسری بغاوت ۲۲۴ھ میں مازندران میں ہوئی تھی جس کو برپا کرنے والا ایک زرتشتی مازیار بن قارن تھا، وہ چاہتا تھا کہ طبرستان سے مسلمانوں کو نکال پھینکے اور وہاں پر زرتشتی حکومت قائم کرے۔ مازیار کی یہ بغاوت کامیاب نہ ہو سکی کیونکہ آلِ طاہر کی فوجوں نے خلیفہ کی فوجوں کا ساتھ دیا۔ ۲۲۴ھ میں ہی مازیار گرفتار کر لیا گیا اور ۲۲۵ھ میں سامرا کے مقام پر قتل کر دیا گیا۔

بنی عباس کے زمانۂ حکومت کو ڈاکٹر صفا نے دو حصوں میں تقسیم کرتے ہوئے اپنی اس رائے کا اظہار کیا ہے۔

دورۂ اول کہ دورہ ترقی و عظمت است و تا عہد مامون امتداد داشت (۱۳۲-۲۱۸ھ) دورۂ دوم کہ دورہ انحطاط وضعف است و از آغاز خلافت معتصم تا انقراض حکومتِ عباسی ممتد بودہ است (۲۱۸-۶۵۶ھ) دورۂ اول دورۂ غلبہ نژاد ایرانی و نفوذ قطعی آں در دربار بنی عباس است ولی از عہد خلافت معتصم مقدماتِ تسلط

پہلا دور جو کہ ترقی و عظمت کا دور ہے مامون کے عہد تک محیط ہے (۱۳۲-۲۱۸ھ) دوسرا دور جو کہ انحطاط اور زوال کا دور ہے معتصم کی خلافت کی ابتدا سے شروع ہو کر عباسی خلافت کے خاتمے پر ختم ہوتا ہے (۲۱۸-۶۵۶ھ) پہلا دور عباسی دربار میں ایرانی قوم کے غلبے اور ان کے مکمل نفوذ کا دور ہے لیکن معتصم کی خلافت کے آغاز ہی سے ترکوں کے تسلط اور

ترکان و شکست ایرانیان فراہم شد
بدیں معنی کہ معتصم فواد و سپاہیان
خود را از میان ترکان برگزید
و اگرچہ براثر این عمل او عنصر
عرب ہم چنان در خذلان
باقی ماند ولی ایرانیان نیز بتدریج
از صحنۂ سیاستِ دربار عبّاسی
بیرون رفتند تا باز براثر استیلا
آل بویہ بر بغداد بزور و غلبہ
سیاست قبلی را برائے مدت
محدودی کہ بغلبۂ سلاجقہ
در نیمۂ اول قرن پنجم ختم
می شود، بدست آورند۔ نفوذ
ترکان در دربار بنی العبّاس
یکے از اسباب عمدہ و اساسی
ضعف خلافت عباسی و
ایجاد علل سقوط آنان بودہ است
و از ہمیں دورہ بہ بعد است
کہ بتدریج مقدمات تجزیۂ ممالک
اسلامی و انحطاطِ تمدنِ
اسلامی و ضعف دولت عبّاسی
ایجاد شد[1]۔

ایرانیوں کے شکستِ کے اسباب اس طرح
فراہم ہونے لگتے ہیں کہ معتصم اپنے فوجیوں
اور مخصوص لوگوں کا انتخاب ترکوں میں
سے کرنا شروع کر دیتا ہے اگرچہ اس کے
اس عمل کی وجہ سے عربی اثرات کو بھی نقصان
پہنچا لیکن ایرانی بھی اسی عمل کے نتیجے میں
دھیرے دھیرے کر کے دربار کی سیاست
سے باہر نکلتے گئے۔ آل بویہ کے اقتدار
کے زمانے میں (ایرانیوں نے) ایک بار
پھر تھوڑے سے زمانے کے لیے تسلط
حاصل کیا اور بغداد کی سیاست پر جبر و
غلبہ کے ساتھ حاوی ہو گئے۔ یہ عہد
سلجوقیوں کے غلبے یعنی پانچویں صدی کی
ابتدا میں اختتام پذیر ہوتا ہے عبّاسی
دربار میں ترکوں کا در آنا ان اسباب
میں سے ایک سبب تھا جس نے عبّاسی
حکومت کو صرف کمزور ہی نہیں کیا بلکہ
آگے چل کر اس کے خاتمے کا بھی سبب بنا۔
اسی زمانے سے ان اسباب کی بنا پڑی
جن کی وجہ سے اسلامی ملکوں، اسلامی
تمدن اور عبّاسی حکومت سب ہی کا
زوال شروع ہوا۔

ڈاکٹر صفا نے عباسیوں کے دورِ حکومت کے بارے میں جن خیالات کا

---

[1] تاریخ ادبیات در ایران، جلد اول، ص ۲۱۷

اظہار فرمایا ہے اور جن کی قدم قدم پر قدما کی تحریروں سے توثیق بھی کرتے گئے ہیں وہ اس بات کو واضح کرنے کے لیے کافی ہیں کہ عباسیوں کے دورِ حکومت میں بھی جبکہ ایرانیوں کو درباری سیاست میں خاصہ عمل دخل حاصل تھا۔ ان کی ایک بڑی تعداد عبّاسیوں کے غلبہ کے خلاف بھی اندر ہی اندر گھٹتی رہی۔ مامون کے عہدِ حکومت تک تو ایرانی قوم کے لوگ عبّاسی بادشاہوں کی بادشاہت کسی نہ کسی طرح گوارا کرتے رہے کیونکہ ان بادشاہوں کے بیشتر مددگار ایرانی امرا اور سردار تھے لیکن جب معتصم کے زمانے سے عباسیوں کے دربار پر ترکوں کا غلبہ ہونے لگا اور وہ حکومت کے کاروبار میں سیاہ وسفید کے مالک ہونے لگے تو یہ صورتِ حال ایرانیوں کو مزید ناگوار ہوئی اور انھوں نے اس عہد میں بھی اسی طرح بغاوتیں کیں جس طرح بنی امیہ کے عہد میں کرتے تھے۔ ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا نے اس صورتِ حال پر اس باب میں بڑی اچھی طرح روشنی ڈالی ہے جس میں انھوں نے ظہورِ اسلام سے لے کر یعقوب بن اللیث صفاری کی بغاوت تک کے زمانے کے ایران کے اجتماعی حالات سے بحث کی ہے اور ان ہی اجتماعی حالات کی روشنی میں انھوں نے اس دور میں پیدا ہونے والے ادب کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے کی بھی ان کی رائے ناظرین کے سامنے پیش کر دی جائے۔

اس سلسلہ میں ڈاکٹر صفا کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ جب عربوں کے ہاتھوں ساسانیوں کی حکومت کا خاتمہ ہوا تو ایرانی قوم کے افراد دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے ایک کثیر تعداد تو ایسے لوگوں کی تھی جنھوں نے مسلمانوں کو جزیہ دینا اور اس طرح اپنے مذہب، علم و ادب اور ثقافت و تمدن کی حفاظت کو انسب سمجھا۔ اس گروہ کے لوگوں میں مختلف مذاہب کے پیرو شامل تھے۔ جن میں عیسائی، زرتشتی، مانوی، مزدکی اور بودھ مذاہب کے ماننے والے شامل تھے۔ ان لوگوں نے اپنی تمام روایات، قدیم زمانے سے مشہور چلی آرہی حکایتیں، مذہبی اور تاریخی کتابیں جو اوستائی، پہلوی یا اس زمانے کی متداول دوسرے خطوط میں لکھی گئی تھیں سب ہی چیزوں کو محفوظ رکھا اور اپنی عظمت پاستان کو کبھی بھی اپنے دل سے

محو نہ کر سکے۔ ان لوگوں نے اپنے ان ورثوں کی صدیوں تک اس طرح حفاظت کی کہ اس زمانے کی بعض یادگاریں ہمارے زمانے تک محفوظ ہیں۔ ایرانیوں کا دوسرا گروہ جو مسلمان ہوگیا تھا اس کے بارے میں ڈاکٹر صفا کا یہ خیال ہے کہ ان کے مسلمان ہونے کے تین محرکات تھے یا تو وہ بزورِ شمشیر مسلمان کر لیے گئے تھے یا ان کے جذبۂ ایمانی نے ان کو اس جدید مذہب کو قبول کر لینے پر آمادہ کیا تھا یا پھر وہ سیاسی اور اجتماعی ضروریات کے تحت حلقہ بگوش اسلام ہوگئے تھے۔ وہ ایرانی افراد بھی مسلمان ہوگئے تھے جن کو فاتح عربوں نے غلام بنالیا تھا ایسے لوگ موالی کہلاتے تھے۔ اس گروہ کے افراد عربی زبان و تمدن سے روشناس ہونے کے بعد مسلمانوں کے مختلف مذہبی اور حکومتی اداروں سے متعلق ہوگئے تھے اور آگے چل کر انھوں نے قابل قدر کارنامے بھی انجام دئے۔

ڈاکٹر صفا کا خیال ہے کہ جب عرب مختلف اقوام کے لوگوں پر غالب آنے لگے اور مختلف قومیں ان کے زیرنگیں ہونے لگیں تو ان میں کبر و غرور اور ظلم و ستم کا مادہ پیدا ہوگیا تھا جس کی وجہ سے وہ غیر عربوں اور بالخصوص ایرانیوں کو نہ صرف حقارت کی نظروں سے دیکھنے لگے بلکہ ان پر ستم بھی ڈھانے لگے۔ ان کے ظلم و ستم کا نشانہ خاص طور سے وہ ایرانی افراد تھے جو عربوں کے قیدیوں کی حیثیت سے ان کے قبائل کے ساتھ رہتے تھے۔ ڈاکٹر صفا کا کہنا ہے کہ عربوں کا خیال یہ تھا کہ انھوں نے مفتوحوں بالخصوص موالی کو کفر و ضلالت کی تاریک وادی سے نکال کر ان پر احسانِ عظیم کیا ہے۔ اس لیے ان لوگوں کو اپنے آقاؤں (عربوں) کا ممنون احسان ہونا چاہئے۔ یہ تمام باتیں اسلام کی روح کے منافی تھیں مگر بنی امیہ کے زمانۂ حکومت میں موالی کے ساتھ یہی سلوک روا رکھا جاتا۔ اسی سلسلۂ سخن میں ڈاکٹر صفا نے یہ بھی لکھا ہے کہ

ظلم و آزار بنی امیہ بہ موالی	ایران اور ماوراءالنہر میں موالی پر بنی امیہ
خاصہ در ایران و ماوراءالنہر	کا ظلم و آزار اس حد تک بڑھ گیا تھا
بدرجۂ رسیدہ بود کہ گاہ بطغیان و	کہ یہ لوگ کبھی بغاوت کرنے یا کبھی بغاوت
شورش آنان دیا پیوستن بقیام کنندگانی	کرنے والوں مثلاً مختار بن ابو عبیدہ

از قبیل مختار بن ابو عبیده و یا اشعث منجر می گردید و بایں کیفیت بخوبی می تواں دریافت که چرا با قیام ابو مسلم بسرعت عجیب عدهٔ بے شماری بر او گرد آمدند[1]"

یا اشعث جیسے باغیوں کے حامی ومددگار بن جایا کرتے۔ اس صورتِ حال سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ابو مسلم کی بغاوت ہوتے ہی کیوں بڑی سرعت کے ساتھ ایک بہت بڑی جماعت اس کے گرد جمع ہوگئی تھی ۔

عربوں کی اس روش کا نتیجہ افتراق بین المسلمین کی شکل میں ظاہر ہوا جس کا سب سے زبردست ردِ عمل ایرانیوں پر ہوا۔ اس ردِعمل کے چند در چند وجوہ تھے جن کو ڈاکٹر صفا نے بہت ہی صاف اور واضح انداز سے اپنے الفاظ میں یوں ادا کیا ہے۔

" این حال بر ایرانیان دشوارتر بود زیرا این مردم صاحب حس ملی بودند چنانکه توجه آنان به موضوع ملیت و علاقه با یران از قدیم ترین آثار ادبی و مذهبی آن، یعنی اوستا گرفته تا آخرین آثار معروف عهد ساسانی، از همه جا بنحو کامل لایح و آشکار است۔ روایات ملی ایرانیان نیز چنانکه آگاهیم بصورتی بود که ایشان را بگذشتهٔ خود مغرور و از حال ناراضی می ساخت و ازین گذشته هنوز یاد عظمت و بزرگواری

ایرانیوں کے لیے یہ حالت بہت پریشان کن تھی کیونکہ یہ لوگ احساسِ ملی رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی توجہ ملی موضوعات اور ایران کے قدیم ترین ادبی اور مذہبی شاہکار اوستا سے لے کر ساسانی عہد کے آخری شاہکاروں تک پر مرکوز رہی (اور اس کے مظاہر ہر جگہ پر صراحت اور قطعیت کے ساتھ واضح و آشکار ہیں۔ جیسا کہ ہم کو معلوم ہے ایرانیوں کی ملی روایتیں اس طرح کی تھیں کہ ان کو ان کے ماضی پر مغرور اور حال سے بیزار بنا تیں۔ اس کے علاوہ ان کے دلوں سے ابھی تک

---

[1] بحوالۂ سابق ص ۱۹

عہد ساسانی از خاطر ایشان نہ رفتہ بود و بایں کیفیات تحقیر ہای تازی بر آنان سخت گران می آمد وہمیں امر مایۂ قیام سخت ایشان در برابر افکارِ عرب شد وبتدریج بہ تحقیر عرب و پست شمردن ایشان از طرفے و بیانِ مفاخر و مآثر اجداد خود از طرفے دیگر کشید[1]

ساسانی عہد کی عظمت وشوکت کی یاد محو نہیں ہوئی تھی۔ اِن حالات میں عرب ان کی جو تحقیر کرتے وہ ان کے لیے ناقابل برداشت ہوتی۔ یہی صورت حال عربوں کے افکار کے خلاف ان کے صف آرا ہونے کا سبب بنی جو دھیرے دھیرے کر کے ایک طرف تو ان کو عربوں کی تحقیر کرنے اور ان کو ذلیل وپست سمجھنے کی طرف مائل کرتی رہی اور دوسری طرف اپنے آباو اجداد کے قابلِ فخر کارناموں کے بیان اور ان کے چھوڑے ہوئے ورثہ کی طرف مراجعت پر بھی اکساتی رہی۔

عربوں کی اس روش کے خلاف جس شخص نے سب سے پہلے ادبی بغاوت کی وہ اسماعیل بن یسار تھا جو ایک ایرانی نژاد غلام اور ہشام بن عبدالملک کے زمانے کا شاعر تھا وہ اپنی بغاوت میں اتنا سخت تھا کہ اس نے ہشام کے رو برو اپنے ایک عربی قصیدے میں ایران کی شوکت پاستان اور ایرانیوں کی عظمت وبرتری کے نغمے سنائے جن کو سن کر ہشام برافروختہ بھی ہو گیا تھا۔

ایرانیوں کی عربوں اور بالخصوص بنی امیہ سے دشمنی روز بروز بڑھتی رہی۔ اور ایرانی قوم کے افراد برابر بنی امیہ کے خلاف بغاوتیں کرتے رہے۔ جب ابومسلم خراسانی کی مدد سے بنی عباس حکومت پر قابض ہو گئے تو ایرانیوں کو عربوں سے بدلہ لینے کا پورا پورا موقع مل گیا اور انھوں نے زندگی کے ہر ہر میدان میں یہ بدلہ لیا بھی۔ ایرانی تہذیب وتمدن، زبان وادب، علم وفن پر جو کچھ عربی رنگ غالب آگیا تھا اس کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی کوشش کی۔ بنی عباس اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ ان کو برسرِ حکومت

---

[1] بحوالہ سابق ص ۱۹ - ۲۰

لانے والے ایرانی قوم کے لوگ ہیں اس لیے اس خاندان کے بادشاہ ایرانیوں کو اعلیٰ مناصب پر فائز کرتے اور ان کے مشوروں سے کار جہانگیری وجہاں بانی انجام دیتے صرف یہی نہیں بلکہ انھوں نے ایرانی عورتوں سے شادیاں بھی کرنی شروع کردی تھیں اور اس بات کا التزام کرنے لگے تھے کہ ولی عہدوں کی مائیں ایرانی ہوں۔ اس طرح حکومت کے کاروبار میں ایرانیوں کا نفوذ بڑھتا گیا اور بنی عباس کے دربار اور گھروں سے عربی خصائص کم سے کم تر ہونے لگے لیکن اس کے باوجود ایک ت ایسی بھی تھی جو ایرانیوں کو اکثر جھنجھوڑ کر رکھ دیتی۔ بقول ڈاکٹر صفا

"بنی عباس در عین توجہ شدید بایرانیان ہیچ وقت فراموش نمی کردند کہ بنی ہاشم واز نژاد عرب اند وبہمین سبب ہم گاہ از نفوذ ایرانیان بیمناک شدند وکشتن و برانداختن بعضی از آنان قیام می کردند چنانچہ سفاح، ابوسلمہ خلال را از میان برد ومنصور ابومسلم را وہارون آل برمک را و مامون فضل بن سہل را ومعتصم افشین را ودر عین حال گاہی سرداران وعمالی از میان اعراب انتخاب می کردند[1]۔

بنی عباس نے ایرانیوں کی طرف بھرپور توجہ دینے کے دوران بھی کبھی اس بات کو فراموش نہیں کیا کہ وہ عربی النسل ہیں اور بنی ہاشم سے (نسبی) تعلق رکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ کبھی کبھی ایرانیوں کے نفوذ سے متوحش بھی ہوتے اور (ایرانیوں میں سے) بعض کو مار ڈالنے اور اکھاڑ پھینکنے کیلیے جنگ بھی کرتے مثلاً سفاح نے ابوسلمہ خلال کو، منصور نے ابومسلم کو، ہارون نے برامکہ کو، مامون نے فضل بن سہل کو اور معتصم نے افشین کو اپنے راستوں سے ہٹا دیا۔ (بنی عباس) اس عالم میں کبھی کبھی اپنے سرداروں اور مقربین کا انتخاب عربوں میں سے کرتے۔

عباسیوں کی اس روش کی وجہ سے ایرانیوں کے جذبات برابر بھڑکتے رہتے جس کی وجہ سے ان کا ملی تعصب بھی دن بدن بڑھتا جاتا۔ اسی ملی تعصب کے

---

[1] بحوالہ سابقہ ۲۲۔۲۳

نتیجے میں وہ شعری گردش عالم وجود میں آئی جس کا سب سے بڑا نمائندہ بشار بن برد ہے جس کے اشعار عربوں کی تحقیر و تذلیل سے بھرے ہوئے ہیں۔ ایرانیوں کی اس روش کی وجہ سے عباسی بادشاہ بھی ان سے کچھ کچھ بدگمان رہنے لگے اور اندر ہی اندر عباسیوں اور ایرانیوں کی یہ آویزش بڑھتی رہی حالات کے اُتار چڑھاؤ کے تحت کبھی عباسی دربار پر ایرانیوں کا مکمل غلبہ ہو جاتا اور کبھی وہ اس سے یک گونہ دور بھی ہو جاتے۔ منصور، مہدی، ہارون اور مامون کا عہدِ حکومت ایرانیوں کے لیے بالعموم سازگار رہا۔ مامون کی موت کے بعد جب معتصم بادشاہ ہوا تو حالات نے ایک نیا پلٹا کھایا اور ایرانیوں کی جگہ پر ترک عباسی دربار میں بار پانے لگے۔ بقول ڈاکٹر صفا ترکوں کا غلبہ اس قدر بڑھا کہ ایرانی اور عرب دونوں ہی حکومت کے پیش منظر سے رفتہ رفتہ غائب ہونے لگے۔

اس موقع پر ہم کو تھوڑی دیر رک کر شعوبی تحریک کا بھی جائزہ لے لینا چاہیے جس نے ایرانی معاشرہ پر دور رس اثرات چھوڑے اور جس کی وجہ سے آگے چل کر ایرانی قوم کے افراد اس قابل ہو سکے کہ وہ اپنی ایک آزاد اور قومی حکومت قائم کر سکیں۔

گزشتہ سطور میں ذکر کیا جا چکا ہے کہ مسلسل فتحوں نے عربوں کو مغرور بنا دیا تھا اور ان کا غرور اس حد تک بڑھ چکا تھا کہ وہ تمام دوسری غیر عرب قوموں کی تذلیل کرنے لگے تھے۔ عربوں کی اس روش کا ردِعمل تقریباً ہر قوم پر ہوا لیکن ایرانیوں کا ردِعمل دوسری قوموں کے مقابلے میں زیادہ سنگین تھا کیونکہ وہ پہلے ہی سے "تفاخرِ ملی" کے گرفتار اور اپنی عظمت و بزرگی کے مبلغ و منادی تھے عربوں نے اسلام کے اصول مساوات کو طاقِ نسیاں پر رکھ دیا اور رنگ و نسل کے نشہ سے مخمور ہو گئے۔ اس کا جو کچھ نتیجہ ظاہر ہو اس کی طرف گزشتہ سطور میں کچھ اشارے کر دیے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ عربوں سے نفرت کا جذبہ اگرچہ ایرانیوں میں پہلی صدی ہجری ہی میں پیدا ہو گیا تھا اور بنی امیہ کے عہدِ حکومت میں بہت سے ایرانی شعراء اور دانشور اعلانیہ اپنے ان جذبات کا اظہار بھی کرتے تھے مگر ان کو "شعوبی" کے نام سے نہیں یاد کیا جاتا۔ یہ اصطلاح

بنی عباس کے زمانے میں رائج ہوئی اور ایک مخصوص فکر کے حامل گروہ کو "شعوبی" کے نام سے موسوم کیا گیا۔

دوسری صدی ہجری کے اوائل سے چوتھی صدی ہجری کے خاتمے تک یہ تحریک اپنے پورے عروج پر رہی۔ اس تحریک کے زیرِ اثر جو شعراء سامنے آئے انھوں نے عربی زبان ہی کو اپنے جذبات کے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ ان شعراء میں خریمی، المتوکلی، بشار بن برد کے نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ نثر نگاروں میں بھی بہت سے ایسے افراد تھے جو عربوں کی مخالفت اور تحقیر میں مستقل کتابیں لکھتے جن میں ابو عثمان سعید بن حمید بختکان، ہیثم بن عدی، سہل بن ہارون، ابو عبیدہ معمر بن المثنیٰ کے نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ چوتھی صدی ہجری کے بعد یہ تحریک بظاہر اپنی عمر ختم کرکے ہمیشہ کے لیے معدوم ہوگئی مگر اس نے اپنے جو اثرات چھوڑے وہ بھی کچھ اہم نہیں۔ ان اثرات کی طرف ڈاکٹر صفا نے ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے۔

"ایں کتب بر اثر تغییر روشِ فکری ایرانیان در اعصار بعد و نفوذِ شدیدِ اسلام و نظائرِ ایں امور از میان رفت ولی از آنہا یک اثر مہم و جاوید باقی ماند و آں عبارت است از تحریک حس ملّی ایرانیان و بیدار کردن آنان برائے مفاخرہ و مقابلہ با قوام عرب و قیام برائے تحصیل استقلالِ از دستِ رفتہ[1]۔"

بعد کے زمانے میں اسلام کے شدید نفوذ اور ایرانیوں کے طرزِ فکر کی تبدیلی کی وجہ سے یہ کتابیں معدوم ہوگئیں۔ لیکن ان کا ایک زبردست اور اَن مٹ اثر باقی رہا جو ایرانیوں کی "حس ملی" کو متحرک رکھنے اپنے قابل فخر کارناموں کو بیان کرنے، عربوں سے مقابلہ کرنے، عربوں کے خلاف بغاوت کرکے اپنی آزادی گم گشتہ کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے ان کو بیدار کرنے سے عبارت ہے

شعوبی تحریک ایرانیوں کے دلوں میں عربوں کے خلاف نفرت کی آگ

---

[1] بحوالہ سابق ص ۲۹

بھڑکائے رہی۔ اگرچہ مامون نے طاہر ذوالیمینین کو خراسان کی امارت پر فائز کر کے ایرانیوں کا دل جیتنے کی پوری پوری کوشش کی مگر نفرت کی جو آگ بھڑک رہی تھی وہ نیم خود مختار حکومت پر کس طرح راضی ہو سکتی تھی۔ اسی نفرت کا نتیجہ تھا کہ طاہریوں کے پچپن سالہ دور اقتدار کے بعد ایرانیوں کو اس بات کا موقع مل گیا کہ وہ اپنی ایک خود مختار حکومت قائم کریں۔ اس کام کو انجام دینے والا یعقوب بن اللیث صفاری تھا۔ یہ وہ پہلا شخص ہے جس نے بزور شمشیر ایران کے ایک بڑے رقبے پر آزاد ایرانی حکومت قائم کی اس لیے ڈاکٹر صفا نے اس کے حالات بڑی تحقیق اور تفصیل سے لکھے ہیں جس کی تلخیص یہاں پیش کی جاتی ہے۔

یعقوب کی زندگی پر نظر ڈالنے سے پہلے اس کے وطن سیستان کی تاریخ اور اس کے عہد کی ایک تحریک پر نظر ڈالنی ضروری ہے جس کے افراد "عیاران" کے نام سے موسوم تھے۔ جیسا کہ تاریخ کے اوراق سے معلوم ہوتا ہے ۳۰ھ میں جبکہ حضرت عثمانؓ کی خلافت کا عہد تھا سیستان کا علاقہ بڑی سخت جنگ کے بعد عربوں کے زیرِ نگیں آیا تھا لیکن سیستانیوں نے عربوں کے قبضہ کو کبھی دل سے قبول نہیں کیا اسی لیے وقتاً فوقتاً وہاں کے رہنے والوں نے مسلمانوں کے خلاف بغاوتیں کیں جو اگرچہ فرو کر دی گئیں مگر ان کے اثرات مدتوں تک باقی رہے۔ سرزمینِ سیستان کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ خوارج کی پناہ گاہ بنی ہوئی تھی اسی لیے یہ سرزمین ہمیشہ فتنہ و فساد کی آماجگاہ رہتی۔

سیستان کے علاقہ میں جو زرتشتی آباد تھے وہ اگرچہ اپنے مذہبی احکام پر عمل کرنے کے لیے پوری طرح سے آزاد تھے مگر چونکہ ان کے عقیدہ کے مطابق یہ سرزمین تقدس کی حامل تھی اس لیے وہ اس پر کسی غیر قوم اور غیر مذہب کے افراد کا قبضہ برداشت نہیں کر سکتے تھے یہی وجہ ہے کہ وہ برابر عربوں کے خلاف بغاوتیں کرتے رہے۔

چونکہ یہ سرزمین مرکز خلافت سے کافی دور واقع تھی اور یہاں کے بیشتر باشندے اپنے قدیم مذہب یعنی مذہب زرتشتی پر قائم تھے اسی لیے اس علاقے

تھوڑی تھوڑی مدت کے بعد بغاوتیں ہوتیں۔ خوارج نے بھی اس زمانے میں جتنے خروج کیے ان سب کا بھی مرکز یہی علاقہ تھا۔ ایسے ماحول اور ایسے لوگوں کے درمیان یعقوب بن اللیث صفاری پیدا ہوا جس نے آگے چل کر طاہریوں کی حکومت کا خاتمہ کر کے ایک خود مختار ایرانی سلطنت کی بنیاد رکھی۔

جس زمانے میں یعقوب بن اللیث پیدا ہوا اس زمانے میں سیستان میں ایک گروہ ایسا بھی تھا جو "عیاران" یا "جواں مردان" یا "فتیان" کے نام سے موسوم تھا۔ اس گروہ کے لوگ عام طور سے عوام الناس کے طبقہ سے تعلق رکھتے اور اپنی جواں مردی، شجاعت اور نبرد آزمائی میں طاق ہوتے۔ ان لوگوں نے اپنے کچھ رسم و رواج بھی مقرر کر رکھے تھے جو ان کو دوسرے افراد سے الگ کرتے۔ جنگ کے زمانے میں یہ گروہ کبھی امرا کی طرف سے لڑتا اور کبھی امرا کے مخالفین کی طرف سے۔ ان لوگوں کا اثر خراسان تک پہنچ گیا تھا اور وہاں بھی اس تحریک کے بہت سے ماننے والے پیدا ہو گئے تھے۔ اس گروہ کا سردار "سرہنگ" کے نام سے موسوم ہوتا جو ان لوگوں کو کمان کرتا۔ ڈاکٹر صفا نے تاریخ سیستان کے حوالے سے یہ ثابت کرتے ہوئے کہ یعقوب بن اللیث کا تعلق "عیاران" سے تھا جو تفصیل درج کتاب کی ہے اس کا ایک اقتباس یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

"این مرد بزرگ ایران از دستهٔ عیاران سیستان بود۔ و در آغاز کار خود در دستگاهِ صالح بن نصر مالکِ بستی که بر عامل طاہریان خروج کرده بود بسر می برد۔ برادر این صالح بن نصر یعنی عثمان بن نصر بن مالک در عہد حکومت طاہر بن عبداللہ بن طاہر در خراسان و سیستان بر عامل او خروج کرد و

ایران کے اس جلیل القدر انسان کا تعلق عیارانِ سیستان کی جماعت سے تھا۔ اس نے اپنی عملی زندگی کا ابتدائی زمانہ، طاہریوں کے عامل کے خلاف بغاوت کرنے والے صالح بن نصر مالکِ بستی کی معیت میں بسر کیا۔ صالح مذکور کے بھائی عثمان بن نصر بن مالک نے طاہر بن عبداللہ بن طاہر کے عہد حکومت میں خراسان اور سیستان میں اس کے عامل کے خلاف بغاوت کی تھی اور نتیجتاً

کشته شد و برادرش صالح پس از
قتل وی بخون خواہی برخاست
و بزودی جمعیتی بزرگ از مردم
سیستان خاصه عیاران براو گرویدند
درمیانِ آنان سرہنگی از
عیاران بود بنام یعقوب لیث الصفار
وی که نسب خود را به گرشاسپ
و از او به جمشید می رسانید۔
پسر رویگری از اہالی قرنین
(ستورگاه اسبان رستم) از قرار
سیستان مانند ہمهٔ سیستانیان
آں عصر مردی میہن پرست
و متخلق به اخلاق و آئین ایرانی
و از دستهٔ مشہور عیاران بوده
است که بر اثر لیاقت و شجاعت
مہربانی و جواں مردی محبوب
یاران و ہم مسلکان خود شد و
گروہی بروے گرد آمدند و او
در شمار سرہنگان عیارانِ
سیستان درآمد و ہنگامی کہ صالح
بن نصر بر عامل طاہر بن
عبداللہ (۲۰۰-۲۴۸) خروج کرد
از یاران و طرف دارانِ وے
شد و چنانکہ دیدیم بزودی
مایهٔ رونق کار صالح شد و او

مارا گیا تھا۔ صالح بھائی کے قتل کے بعد
اس کے خون کا انتقام لینے کے لیے اٹھ
کھڑا ہوا۔ بہت ہی جلد سیستان کے لوگوں
بالخصوص عیارانِ سیستان نامی جماعت
کے لوگوں کی ایک بڑی تعداد اس کے گرد
جمع ہو گئی عیارانِ سیستان کی اس جماعت
میں یعقوب اللیث صفار نام کا ایک فوجی
افسر بھی تھا، جو اپنا سلسلۂ نسب گرشاسپ
سے اور اس کے ذریعہ جمشید سے ملاتا تھا
یعقوب سیستان کے قرنین نامی مقام
(یہاں رستم کے گھوڑوں کا طویلہ تھا) کے
ایک ٹھٹھیرے کا لڑکا تھا اور اپنے زمانے
کے تمام سیستانیوں ہی کی طرح وطن پرست،
ایرانی اخلاق و رسم و رواج سے متصف
اور عیارانِ سیستان نامی جماعت سے
تعلق رکھتا تھا۔ وہ اپنی لیاقت، شجاعت،
لطف و کرم اور جواں مردی کی وجہ سے
اپنے دوستوں اور ہم مسلکوں میں ہر دلعزیز
ہو گیا اور ایک بڑی جماعت اس کے گرد
جمع ہو گئی، اس کا شمار عیارانِ سیستان
کے فوجی افسروں میں ہونے لگا جس وقت
صالح بن نصر نے طاہر بن عبد اللہ
(۲۴۸تا۲۰۰ھ) کے عامل کے خلاف
بغاوت کی یعقوب اس کا مددگار بن گیا
اور جیسا کہ ہم نے دیکھا صالح کے مقصد

توانست بیاری یعقوب و دیگر عیاران
سیستان بر این ولایت دست
یابد۔ در ہمیں حال عمار خارجی
در سیستان ظہور کرد و یعقوب
او را از میان برد ؛ ہم چناں
در خدمت خود باقی و روز
و شب در مبارزہ بود تا سر
انجام با دیگر عیاران بر صالح
بن نصر کہ بیہودہ مردم را مصادرہ
و شہرہا را غارت می کرد بشورید و
و او را در جنگے کہ بسال ۲۴۸ھ بادی
کردہ بود از میان برد۔ در محرم
ہمیں سال مردم سیستان با او
بامارت بیعت کردند و از یں سال
تا سال ۲۵۴ھ مشغول سرکوب مخالفان
خود در سیستان از قبیل صالح
بن نصر سابق الذکر و عمارِ خارجی
و زنبیل (رتبیل)، پادشاہ کابل و
بدست آوردنِ آلت و عدت بود
و از یں سال شروع بہ توسعۂ
تملکات خود کرد و کرمان را بہ یک
تاختن در اختیار خود در آورد و بسال
۲۵۹ھ خراسان را فتح نمود و محمد بن طاہر
آخرین فرد از طاہریان را اسیر کرد
و بہ سیستان فرستاد و از نیشاپور بہ گرگان

کار نے (اس کی مدد سے) تقویت پائی اور
صالح اس قابل ہو سکا کہ یعقوب اور دیگر عیاران
سیستان کی مدد سے اس ولایت پر قابض
ہو جائے۔ اسی زمانے میں سیستان میں
عمار خارجی کا بھی ظہور ہوا جس کو یعقوب نے
شکست دی۔ یعقوب ہمیشہ جنگ میں مصروف
رہتا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے اس
صالح کے خلاف جو لوگوں پر بیکار جرمانے
کرتا اور شہروں کو تباہ و غارت کرتا، بغاوت
کردی اور اس کو اس جنگ میں جو ۲۴۸ھ
میں ہوئی تھی شکست دے دی۔ اسی سال
کے محرم کے مہینے میں سیستان کے لوگوں نے
یعقوب کی امارت پر بیعت کی اور اس سال
لے کر ۲۵۴ھ تک وہ سیستان میں اپنی قوت
مجتمع کرنے اور اپنے مخالفوں کی سرکوبی
میں مشغول رہا۔ (ان مخالفوں میں) سابق
الذکر صالح بن نصر، عمار خارجی (کے علاوہ)
زنبیل یا رتبیل، بھی شامل تھا جو کابل کا بادشاہ
تھا۔ اسی سال کے آغاز سے اس نے اپنے
حدودِ امارت میں توسیع بھی شروع کی یعقوب نے
کرمان کو ایک ہی حملے میں اپنے قبضے میں کر لیا
اور محمد بن طاہر کو جو طاہریوں کے خاندان کا
آخری فرد تھا گرفتار کر کے سیستان بھیج دیا
پھر نیشاپور سے گرگان اور طبرستان گیا۔
اس نے حسن بن زید علوی کو شکست دی

وطبرستان رفت و حسن بن زید علوی
را شکست و بسال ۲۶۱ھ فارس را
گشود و دریں حال نامہ ئی بہ معتمد
خلیفہ نوشت و نسبت بہ وی و موفق
برادر و ولی عہد او اظہار اطاعت
کرد و خلیفہ نیز فرمان حکومت خراسان
وطبرستان و گرگان و فارس و کرمان
و سند و ہند و شرطۂ بغداد را در ہمیں
سال برائے یعقوب فرستاد۔ اما
یعقوب درایں سال بدونِ مقدمہ
خلاف خویش را بہ معتمد خلیفہ
آشکار کرد و با سپاہی بزرگ
بہ بغداد حملہ برد۔ در جنگی کہ
میان یعقوب و موفق برادر معتمد
در گرفت سخت شکست در
سپاہیان خلیفہ افتاد ولی
آنان آبِ دجلہ را بہ لشکرگاہ
یعقوب افگندند و شکست
در کار او آمد و ناگزیر بہ
جندیشاپور رفت تا باز تہیۂ
سپاہ بیند ولی درایں بہ مرض قولنج
درگذشت (۲۶۵ھ)[1]"

اور پھر ۲۶۱ھ میں فارس پر قبضہ کرلیا
اسی زمانے میں اس نے خلیفہ معتمد کو
ایک خط لکھا جس میں اس نے خلیفہ
اور اس کے ولی عہد اور بھائی موفق سے
اپنی اطاعت گزاری کا اظہار بھی کیا۔
خلیفہ نے بھی اسی سال یعقوب کو خراسان،
طبرستان، گرگان، فارس، کرمان، سندھ،
ہند اور شرطۂ بغداد کی حکومت کا فرمان
بھیجا۔ لیکن یعقوب نے بلا کسی سبب کے
معتمد کے خلاف بغاوت کردی اور ایک
بڑی جماعت لے کر بغداد پر چڑھ آیا۔
اس جنگ میں جو یعقوب اور معتمد کے
بھائی موفق کے درمیان ہوئی تھی پہلے
تو خلیفہ کی فوجوں کو شکست ہوئی لیکن
خلیفہ کی فوجوں نے دجلہ کے پانی کو
یعقوب کے لشکرگاہ کی طرف پھیر دیا اس
طرح یعقوب کی فوجوں کو شکست ہوگئی
اور وہ مجبور ہوکر نیشاپور کی طرف اس
غرض سے چلا گیا کہ وہاں جاکر دوبارہ
اپنی فوجوں کو مجتمع کرے لیکن وہیں پر
اس کو قولنج کا مرض لاحق اور وہیں اسی
مرض میں چل بسا۔

ڈاکٹر صفا کا یہ طویل اقتباس قصداً پیش کیا گیا ہے تاکہ اندازہ ہوسکے کہ

---

[1] بحوالہ سابق ص ۲۷-۲۸

وہ اپنی بات کو کس حد تک اور کن کن ذرائع سے پایۂ تحقیق تک پہنچا دیتے ہیں۔
یعقوب بن اللیث کے عیارانِ سیستان سے تعلق رکھنے کی طرف ابھی تک کسی تاریخ ادبیاتِ فارسی کے مؤرخ نے اشارہ نہیں کیا تھا۔ ڈاکٹر صفا وہ پہلے تاریخ ادبیات کے مؤرخ ہیں جنھوں نے اس تاریخی حقیقت کی بازیافت کی ہے اور تاریخ سیستان کی مدد سے خود عیاران کے بارے میں بھی قابلِ قدر معلومات فراہم کی ہیں۔ تاریخِ ادبیات کو مرتب کرتے وقت وہ اس طرح کے جزوی یا ضمنی مباحث پر بھی سیر حاصل بحث کرتے ہیں اور تا حدِ امکان اس موضوع پر زیادہ سے زیادہ مواد فراہم کر دینے کی کوشش کرتے ہیں۔
یعقوب بن اللیث نے ایران میں جس حکومت کی بنیاد ڈالی اس کی مدت عمر اگرچہ کم ہی تھی لیکن یہ حکومت ایرانیوں کی خود مختار حکومت تھی جو صرف نام ہی کے لیے خلیفہ کی تابع رہ گئی تھی۔ یہ اسی حکومت کا فیضان ہے کہ اس کے خاتمے کے بعد سامانی، زیاری، آل بویہ، اور غزنوی خاندانوں کے افراد اس قابل ہو سکے کہ وہ ایران کی خود مختار حکومت کے بادشاہ کہلائیں اگرچہ ان خاندانوں کے حکمراں بھی نام کے لیے خلفاء کے تابع تھے مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام بادشاہ اپنے اپنے اعمال میں آزاد اور خود مختار تھے۔
ایرانی تاریخ کے اس پہلو کو محققانہ طور سے واضح کرنے کے بعد ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا نے اس دور کے مذہبی (اسلامی، فرقے)، ان کے اختلافات اور اختلافات سے پیدا ہونے والے مسائل کا مفصل و مدلل جائزہ لیا ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر صفا کی پیش کردہ تمام معلومات کا احاطہ کرنا تو ہمارے لیے دشوار ہے البتہ ہم ان کے فرمودات کے ان بعض گوشوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کریں گے جن سے ترتیب مقدمہ میں بھی مدد ملے اور ڈاکٹر صفا کی انفرادیت بھی واضح ہو جائے۔

ایران ہو یا اس عہد کا کوئی دوسرا اسلامی ملک، ہر ملک میں مسلمانوں کے تین بڑے مذہبی فرقے یعنی خارجی، شیعہ اور سنی پیدا ہو چکے تھے جن کے آپس کے مذہبی اور سیاسی اختلافات مستقل جنگ و جدل کی صورت میں ظاہر ہوتے رہتے تھے

ڈاکٹر صفا نے بھی ان فرقوں کے آغاز، ان کے مخصوص عقائد اور ان کی خصوصیات سے بحث کرتے ہوئے اس بات کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس فرقہ کا اثر ایران کی سیاسی، سماجی، اجتماعی اور مذہبی زندگی پر کیا پڑا۔ یہ کدّ و کاوش ان کو اس لیے کرنی پڑی ہے تاکہ آگے چل کر وہ ایران میں پیدا ہونے والے ادب کا جائزہ ان ہی مباحث کی روشنی میں لے سکیں۔ مسلمانوں کے مختلف فرقوں سے بحث کرتے ہوئے سب سے پہلے انھوں نے خوارج کو اپنا موضوعِ بحث بنایا ہے اور ان کے مخصوص افکار و آراء سے بحث کرکے ان کی خصوصیات پڑھنے والوں پر واضح کردی ہیں۔ اس موقع پر ہم ان کے ان تمام بیانوں سے صرف نظر کرتے ہوئے صرف اس بیان کو پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں جس میں انھوں نے یہ دکھلانے کی کوشش کی ہے کہ خوارج کا اثر ایران اور ایرانی زندگی پر کیا پڑا اس سلسلے میں ان کا خیال ہے۔

"اہمیت خوارج در تاریخ ایران بیشتر است۔ خوارج ایران بیشتر در سیستان و خراسان قدرت داشتند و در سہ قرنِ اول ہجری غالباً تشکیل دستہ ہائے بزرگ می دادہ و تسلط خلفا را بر ایں نواحی دشوار می ساختہ اند چنانکہ خلفا گاہ مجبور می شدند بتن خود برائے رفع مزاحمت آنان لشکرکشی کنند وحتی باید گفت نہضت خوارج در نواحی مشرقی ایران وسیلہ ای برائے مخالفت با حکومت مرکزی اسلام شدہ بود و اشخاصی بسیار معروف از میان خوارج مشرق ظہور کردہ اند کہ در راس

ایران کی تاریخ میں خارجیوں کی بڑی اہمیت ہے ایران کے خارجیوں کو زیادہ تر سیستان اور خراسان میں قوت حاصل تھی۔ انھوں نے شروع کی تین ہجری صدیوں میں ایک بڑی جماعت بنالی تھی اور خراسان و سیستان کے علاقوں میں خلفا کے اقتدار کو بڑی سنگینیوں سے دوچار کر دیا تھا۔ چنانچہ خلفا کبھی کبھی اس بات پر مجبور ہوتے تھے کہ ان کی مزاحمت کو ختم کرنے کے لیے لشکرکشی کریں یہ بات یوں بھی کہی جاسکتی ہے کہ ایران کے مشرقی علاقے میں خارجیوں کی تحریک مرکزی اسلامی حکومت کی مخالفت کا ایک ذریعہ بن گئی تھی مشرقی خارجیوں میں بہت سے نامی گرامی

همه آنان حمزه بن عبدالله خارجی قرار داشت و مادر تاثیر این فرقه در ظهور یعقوب و تحصیل استقلالِ سیاسی ایران پیش ازین سخن گفته ایم[1]"

اشخاص پیدا ہوئے جن میں حمزہ بن عبداللہ خارجی سب سے ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ ہم نے یعقوب کے ظہور اور ایران کی سیاسی آزادی کے حصول کے سلسلے میں اس فرقے کے اثر و نفوذ کا ذکر اس سے پہلے ہی کر دیا ہے

خوارج کی اس اہمیت کی طرف اشارہ کرنے کے بعد انھوں نے فرقۂ شیعہ کی پیدائش اور ایران میں اس کے اثرات پر مفصل بحث کی ہے۔ تاریخ ایران میں اس فرقے کو کیا اہمیت حاصل ہے اور اس فرقے نے ایرانی تاریخ کے دھارے کو موڑنے میں کس طرح مدد دی ہے اس کی تفصیل ڈاکٹر صفا نے ان الفاظ میں بیان کی ہے۔

"اہمیت شیعه در تاریخ ایران سه قرنِ اول ہجری بسیار است۔ بسیاری از قیامہائے پیشروانِ شعب مختلف این فرقه در عہد مذکور در ایران صورت گرفت از قبیل قیام کیسانیه به پیشوائی مختار بن ابوعبیده ثقفی بخونخواہی شہدائے کربلا و قیام یحیٰی بن زید بن علی و قیام شیعۂ آل عباس بپیشوائی ابومسلم در خراسان و ابوسلمه در عراق و قیام سادات طالبیه در مازندران وغیره و از میان این قیامہا علی الخصوص دو قیام آخر چنانکه می دانیم

ابتدائی تین ہجری صدیوں کی ایران کی تاریخ میں شیعہ فرقہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے مختلف قبائل کے سرداروں کی بغاوتوں کی وجہ سے عہد مذکور کے ایران میں یہ فرقہ تکمیل پذیر ہوا۔ مثلاً شہدائے کربلا کے خون کا انتقام لینے کے لیے ابوعبیدہ ثقفی کی سربراہی میں کیسانیہ کی بغاوت، یحییٰ بن زید بن علی کی بغاوت، خراسان میں ابومسلم کی سربراہی میں شیعانِ بنی عباس کی بغاوت، عراق میں ابوسلمہ کی بغاوت، مازندران میں سادات طالبیہ کی بغاوت وغیرہ۔ جیسا کہ "ہم جانتے ہیں ان بغاوتوں اور خاص طور سے آخر الذکر

---

[1] بحوالہ سابق ص ۴۶

در تاریخ سیاسی و اجتماعی مسلمین عموماً و ایرانیان خصوصاً اثر ظاہر و آشکار داشت۔[۱]

دو بغاوتوں نے بالعموم مسلمانوں اور بالخصوص ایرانیوں کی سیاسی اور اجتماعی تاریخ پر بہت ہی واضح و روشن اثر چھوڑا۔

نامناسب نہ ہوگا اگر یہاں اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کر دیا جائے کہ ڈاکٹر صفا نے جس تفصیل اور شرح و بسط کے ساتھ خوارج اور شیعہ فرقے کے تاریخی رول پر بحث کی ہے اس کا چوتھائی تو کیا ایک بٹا آٹھواں حصہ بھی انھوں نے اہلِ سنت والجماعت کے بارے میں تحریر نہیں فرمایا ہے۔ اہلِ سنت کا تذکرہ انھوں نے صرف ایک حاشیہ میں کیا ہے جو یہ ہے:

"کسانیکہ بخلاف از طریق انتخاب اعتقاد دارند یعنی بعقیدۂ آنان خلافت امری انتخابی و اختیاری است و بانتخاب امت بعد از حضرتِ رسول بہ ابو بکر صدیق، و عمر بن الخطاب و عثمان بن عفان و علی بن ابی طالب رسید، ہمانند کہ بہ اہلِ سنت مشہور اند و اکثریت مسلمین ہموارہ با آنان بودہ است و در ایران نیز تا حدود قرن نہم ہموارہ غلبہ با ایں دستہ بود۔"[۲]

وہ لوگ جو کہ خلافت کے لیے انتخاب کے طریقے کو مانتے ہیں یعنی ان کے عقیدہ کے مطابق خلافت ایک انتخابی اور اختیاری چیز ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد ملت کے انتخاب سے ابوبکر صدیقؓ، عمر بن الخطابؓ، عثمان بن عفانؓ، علی بن ابی طالب (رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین) تک پہنچی، یہ وہی لوگ ہیں جو کہ اہل سنت کے نام سے مشہور ہیں اور مسلمانوں کی اکثریت ہمیشہ اس جماعت کے ساتھ رہی ہے۔ ایران میں بھی نویں صدی ہجری تک ہمیشہ اسی جماعت کو غلبہ حاصل تھا۔

---

۱ بحوالہ سابق ص ۴۹-۵۰ ۲ بحوالہ سابق حاشیہ ص ۴۴

اس حاشیہ سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ ڈاکٹر صفا کے نزدیک بھی ایران میں نویں صدی ہجری تک اسی فرقہ کے افراد کا غلبہ تھا مگر اس اعترافِ حقیقت کے باوجود انھوں نے اس حقیقت کی طرف کوئی روشنی نہیں ڈالی کہ عہد زیرِ بحث میں اس فرقے کے لوگوں نے ایران کی تاریخ کی پیشرفت میں کس قسم کا اور کس حد تک حصہ لیا۔ ان کے عقائد و افکار و آرار کا اثر اس عہد کے ادب پر کیا پڑا؟ غالباً ڈاکٹر صفا کا نظریہ یہ ہوگا کہ ظہورِ اسلام کے بعد وہ تمام لوگ جو ایمان لائے اور مسلمان ہوئے اہلِ سنت تھے۔ اس لیے انھوں نے صرف ان اسلامی فرقوں سے بحث کی ہے جو ایران میں اسلام پہنچنے کے بعد عالمِ وجود میں آئے اور ایران کی تاریخ پر مسلسل اثر انداز ہوتے رہے۔

ان فرقوں کے علاوہ ڈاکٹر صفا نے مرجیہ، قدریہ، جبریہ، معتزلہ، حلولیہ، اہل تناسخ اور اسی قبیل کے دوسرے فرقوں کا تفصیل سے جائزہ لیتے ہوئے اس دور کے ایران کے مذہبی رجحانات کو بڑے اچھے انداز سے پیش کر دیا ہے۔ اس طول وطویل باب کے خاتمے پر اپنے فرمودات کی روشنی میں ڈاکٹر صفا نے جو نتائج اخذ کیے ہیں وہ یہ ہیں

۱۔ ابتدائی تین صدیوں میں ایران کے قدیم مذاہب یکسر ختم نہیں ہو گئے بلکہ ان کے ماننے والے نہ صرف وہاں موجود رہے بلکہ اپنے مذہبی عقائد کے اثرات بھی مسلمانوں پر چھوڑتے رہے جن کی وجہ سے مسلمانوں میں بعض نئے نئے فرقے پیدا ہوئے اس سلسلے میں خاص طور سے فرقۂ حلولیہ کا نام لیا جا سکتا ہے جو سراسر قدیم ایرانی مذاہب کے افکار کا عکاس ہے۔

۲۔ عہد زیرِ بحث میں مسلمانوں میں جتنے مذہبی مناقشات رہے اور ایک فرقہ دوسرے فرقہ سے جس طرح نبرد آزما رہا وہ بھی اس دور کی ایک خاص خصوصیت ہے ان مناقشات سے جہاں بہت سے نقصانات ہوئے ایک بہت بڑا فائدہ بھی ہوا جو ڈاکٹر صفا کے الفاظ میں یہ ہے:

" این مناقشات در افکار و اسلوبہائے فکر مسلمانان و بالنتیجہ در	ان جھگڑوں کا اثر مسلمانوں کی فکر اور اسالیب فکر پر بھی پڑا جس کے نتیجے میں نظم و نثر بھی

شعر و نثر ہم مؤثر افتاد، گذشتہ از آنکہ خود موجب ایجاد ادبیاتِ پُر دامنہ دینی مسلمانان در ایں ایام گردید۔"[1]

ان سے متاثر ہوئے۔ اس کے علاوہ اس زمانے میں خود ہی جھگڑے ایک ایسے ادبیات کے عالم وجود میں آنے کا سبب بنے جس کا دامن مسلمانوں کے دینی افکار سے مالا مال تھا۔

شعر و نثر پر اِن سیاسی اجتماعی اور مذہبی حالات کا جو اثر ہوا اس کی تلاش و جستجو میں ڈاکٹر صفا تاریخ کے اوراق کھنگالتے چلے گئے ہیں لیکن ابھی دُرِ مقصود کے ہاتھ آنے کے لیے کچھ اور سعی و جہد باقی ہے اس لیے اس باب کو ختم کرکے انھوں نے اس بات کا جائزہ لینے کی کوشش فرمائی ہے کہ عہدِ زیرِ بحث میں کون کون سے علوم رائج تھے اور ان کے خصائص کیا کیا تھے۔ اس ضمن میں انھوں نے علومِ شرعی، علومِ عقلی اور علومِ ادبیہ کا بھرپور جائزہ لے کر اپنی تاریخِ ادبیات کو ہر لحاظ سے مکمل بنانے کی کوشش کی ہے۔ اس طول وطویل باب سے صرفِ نظر کرتے ہوئے اب ہم اس باب کا ایک جائزہ لینا چاہتے ہیں جس میں ڈاکٹر صفا نے ظہورِ اسلام سے لے کر تیسری صدی ہجری تک کے ادبی رجحانات پر روشنی ڈالی ہے اسی باب کے سہارے سے ڈاکٹر صفا کی تاریخ ادبیات آگے بڑھے گی اس لیے اب ہم اس باب کا ایک مختصر جائزہ لیتے ہیں۔ اس باب کے شروع میں ڈاکٹر صفا نے جو کچھ رقم فرمایا ہے وہ ان کے تمام مباحث کا مقدمہ قرار دیا جاسکتا ہے اس لیے سب سے پہلے خود ان کی عبارت کو نقل کیا جاتا ہے۔

"در ایں فصل بوضع ادبیات در ایران قرن اول و دوم و سوم ہجری توجہ داریم۔ ہم چنانکہ ایران در ایں سہ قرن میدانِ نفوذ ادیانی از قبیل دین اسلام، زرتشتی، مانوی و عیسوی وغیرہ بود بہمان نحو زبانہائے متعلق بہ ہر یک

اس باب میں ہم پہلی، دوسری اور تیسری صدی ہجری کے ادبیاتِ ایران کی کیفیت کی طرف متوجہ ہوتے ہیں چونکہ مذکورہ صدیوں میں ایران، اسلام، زرتشتی، مانوی اور عیسائی مذاہب کے اثر و نفوذ کا میدان تھا اس لیے ہر مذہب سے متعلق زبانیں یعنی عربی پہلوی

---

[1] بحوالۂ سابق ص ۴۴

از آنہا یعنی عربی و پہلوی و سریانی
و جز آن ہم در ایران رواج داشت،
یعنی در ہماں حال کہ دستۂ از نویسندگان
و گویندگان ایرانی در نثر و نظم عرب
تحصیل مہارت و شہرت می کردند،
دستۂ ہمہ با دبیات سریانی و تالیف
یا ترجمۂ کتب بہ آں سرد کار داشتند
و گروہی سر گرم تالیف کتب دینی و
تاریخی و ادبی بزبان پہلوی بودند۔ در
ہماں حال ہم ادبیات محلی در ولایاتِ
ایران دنبالۂ تکامل طبعی خود را می پیمود
و لہجہ ہائے محلی از طریق آمیزش
با زبانِ عربی تغیر و تحول می یافت و
از میان آنہا برخی از لہجہ ہا مانند
لہجۂ دری آمادۂ آں می شد کہ
دارای ادبیات وسیعی گردد و سرانجام
ہم چنانکہ می دانیم در پایان ایں عہد
کہ زبان دری یعنی لہجۂ مشرق
ایران بعنوان یک لہجہ ادبی مستقل
در آمد و تا روزگار ما
زبانِ رسمی و ادبی و
سیاسی ایران شناختہ
شد[1]۔

سریانی اور اس سے متعلق زبانیں بھی ایران
میں رائج تھیں یعنی اس زمانے میں جب کہ
ایرانی مصنفین اور شعرا کی ایک جماعت
عربی نویسی میں مہارت اور شہرت حاصل
کر رہی تھی تو دوسری جماعت سریانی زبان
میں تصنیف و تالیف یا ترجمے کا کام سرانجام
دے رہی تھی۔ ایک اور جماعت تھی جو پہلوی
زبان میں تاریخی ادبی اور مذہبی کتابیں
لکھنے میں مصروف تھی۔ اسی زمانے میں ایران
کی مختلف ولایتوں کا مقامی ادب بھی اپنے
ارتقا و تکمیل کے طبعی راستے پر گامزن تھا۔
مقامی بولیوں میں عربی زبان کی آمیزش
سے تبدیلی بھی ظہور پذیر ہو رہی تھی۔ ان
بولیوں میں بعض بولیاں ایسی تھیں جو اس
قابل بن رہی تھیں کہ ایک وسیع ادبیات
کو جنم دے سکیں (اس سلسلے میں مثال
کے طور پر) دری (کا نام لیا جا سکتا ہے)
اور اس کا نتیجہ جیسا کہ ہم کو معلوم ہے یہ
ہوا کہ اس عہد کے آخر میں دری یعنی مشرقی
ایران کی بولی ایک ادبی زبان کی شکل
میں ابھر کر سامنے آئی اور ہمارے زمانے
تک ایران کی سرکاری، ادبی اور سیاسی زبان
کی حیثیت سے پہچانی گئی۔

---

[1] بحوالہ سابق ص ۱۳

اپنے اسی نقطۂ نظر کی وجہ سے ڈاکٹر صفا نے عہد زیر بحث کے پہلوی اور عربی ادبیات کا مفصل جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ اس زمانے کے ایران کے سارے "لہجوں" کا بھی تفصیلی جائزہ لیا ہے تاکہ زبان دری کے عالم وجود میں آنے کے اسباب اور اس کے ادب سے بحث کی جاسکے جو اس کتاب کی تصنیف کا خاص مقصد ہے اس لیے ہم بھی پہلوی اور عربی ادبیات کے بارے میں ڈاکٹر صفا نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے اس سے صرف نظر کرتے ہوئے زبان دری کے بارے میں ان کے خیالات کا جائزہ لیتے ہیں۔

ڈاکٹر صفا کے خیال کے مطابق مشرقی ایران کا مشترک "لہجہ" (لہجۂ متداول) جو دری، پارسی، دری، فارسی یا پارسی کے نام سے موسوم ہے عربوں کے حملے کے بعد نہ صرف یہ کہ ایران میں باقی رہا بلکہ عربی زبان کی آمیزش سے دن بدن ترقی کے مدارج طے کرتا گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس میں اتنا وافر اور گوناگوں ادب پیدا ہوا کہ اس بولی کو مستقل زبان کی حیثیت حاصل ہوگئی۔

ڈاکٹر صفا نے اس زبان کی وجہ تسمیہ سے بحث کرتے ہوئے ابن الندیم، المقدسی، ابن حوقل، عبداللہ بن المقنع وغیرہ کی تحریروں سے اس بات کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ دری یا فارسی دری، یا پارسی یا فارسی زبان سے قدما کون سی زبان مراد لیتے ہیں۔ ان تمام بیانات کو نقل کردینے کے بعد ڈاکٹر صفا جس نتیجے پر پہنچے ہیں وہ ان ہی کے الفاظ میں درج ذیل ہے:

"لغت دری یعنی لہجۂ متداول در مشرقی ایران کہ از باب انتساب بہ در (درگاہ سلاطین) بدیں نام خواندہ شدہ چنانکہ بعضی اندیشیدہ اند، ہیچ نسبتی بہ درہ و در (باب البیت) ندارد وقتی مسلم شود کہ لہجۂ دری زبان اہل مشرق خاصہ خراسان و ماوراء النہر بودہ است قبول ایں اصل ہم بر اثر آن

مشرقی ایران کی متداول بولی بادشاہوں کے دربار سے منتسب ہونے کی وجہ سے دری کے نام سے موسوم ہوئی۔ بعض لوگوں کا یہ خیال کہ اس کی وجہ تسمیہ "درہ" اور "دروازہ" کے الفاظ ہیں درست نہیں ہے۔ جس وقت یہ بات تسلیم کرلی گئی کہ دری بولی ایران کے مشرقی علاقے میں بسنے والے خاص کر خراسان اور ماوراء النہر کے

لازم می شود کہ لہجۂ مذکور دنبالۂ لہجۂ پہلوی شمالی یا پہلوی اشکانی است کہ بر اثر گذشت زمان و تحول و تکامل و آمیزش با لہجۂ عربی بصورتی کہ آثار آں را در قرن سوم و چہارم می بینیم در آمدہ است [1]۔

لوگوں کی زبان تھی، تو اس بات کو قبول کرنے کا یہ بھی لازمی نتیجہ نکلتا ہے کہ مذکورہ بولی شمالی پہلوی یا پہلوی اشکانی کا ہی ایک تسلسل ہے جو زمانے کے گذرنے اور ترقی و ارتقا کی راہ پر گامزن ہونے اور عربی کی آمیزش کے بعد اُس صورت میں جلوہ گر ہوئی جس کے آثار ہم تیسری اور چوتھی صدی عیسوی میں دیکھتے ہیں۔

زبانِ دری کے اس تفصیلی تعارف کے بعد ڈاکٹر صفا نے فارسی ادب کی ابتدا کے بارے میں اپنا نظریہ پیش کیا ہے انھوں نے اس سلسلے میں جو کدو کاوش کی ہے اگرچہ وہ بھی خاصہ کی چیز ہے مگر ہم طوالت کے خوف سے ان کے پیش کردہ نظریہ سے کوئی بحث نہیں کریں گے۔ ہم نے اب تک کے مباحث کو قدرے تفصیل سے صرف اس لیے پیش کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ اندازہ ہو سکے کہ ڈاکٹر صفا نے تاریخِ ادبیات کو مرتب کرتے وقت ادبیات سے متعلق انسانی زندگی کے کن کن گوشوں کا مطالعہ کر کے ادبیات کی اصل اور کنہ تک پہنچنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے بعد کی جلدوں میں بھی انھوں نے اپنی اسی روش کو برقرار رکھا ہے اور ہر ہر عہد کے ادبیات کا جائزہ لینے سے پہلے انھوں نے اس زمانے کے ماحول، سیاسی، سماجی، معاشی، معاشرتی اور مذہبی رجحانات کا مفصل تجزیہ کیا ہے تاکہ اس دور میں تخلیق ہونے والے ادبیات کی تفہیم ہمارے لیے آسان ہو جائے۔

اب ہم ڈاکٹر صفا کی تاریخ نویسی کا ایک دوسرے پہلو سے جائزہ لینا چاہتے ہیں ڈاکٹر صفا کی ایک خاص خوبی یہ ہے کہ انھوں نے ادبیات کو چند بندھے ٹکے، محدود نظریات کی مدد سے دیکھنے کی کوشش نہیں کی ہے بلکہ اس کو ایک بہت وسیع پس منظر میں دیکھتے ہوئے اس کے اصل اور کنہ تک پہنچنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے نزدیک ادبیات صرف اپنے خالق کے ہی جذبات و احساسات کا عکاس

---

[1] بحوالۂ سابق ص ۱۶۱

نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنے تخلیق کنندہ کے زمانے کے ماحول، اس زمانے کے دینی رجحانات سیاسی، سماجی، معاشی اور معاشرتی حالات کا بھی عکاس ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صفا کا یہی اندازِ نظر ان کو اپنے معاصرین سے بالکل الگ اور ایک ممتاز و نمایاں مقام پر فائز کرتا ہے۔ "تاریخِ ادبیات در ایران" جیسا کہ نام سے ظاہر ہوتا ہے تاریخ ادبیات سے تعلق رکھتی ہے اور اس کے تمام مباحث تاریخی ہیں بھی لیکن ڈاکٹر صفا نے اپنے ہم عصروں کی روش کے برخلاف اس تاریخی مطالعہ کو کسی حد تک تنقیدی مطالعہ کی بھی شکل دے دی ہے جس کی وجہ سے ان کی مرتب کردہ تاریخ ادبیات ایران دوسرے مؤرخین ادب کی تاریخ سے بالکل الگ ہوگئی ہے۔ اس سلسلے میں ان کے وہ ابواب بہت توجہ اور غور و فکر سے پڑھنے کے لائق ہیں جو انھوں نے ہر ہر عہد کے مذہبی، سیاسی، سماجی اور معاشی حالات سے بحث کرنے کے بعد "وضع ادبی ایران" کے عنوان سے سپردِ قلم فرمائے ہیں۔ ان ابواب میں وہ ذبیح اللہ صفا جو مؤرخ ادب ہی نہیں ناقد بھی ہے پوری طرح جلوہ گر نظر آتا ہے۔

ڈاکٹر صفا نے اپنی اس رائے کو کئی جگہوں پر مختلف انداز سے پیش کیا ہے کہ ادبیات کا وجود خیالی یا واہمہ کی فضا میں نہیں ہوتا بلکہ وہ جس زمانے میں تخلیق ہوتا ہے اس زمانے کے مذہبی اور افسانوی خیالات، سیاسی، سماجی، معاشی اور معاشرتی رجحانات کا بھی عکاس ہوتا ہے۔ اپنے ماحول کی اس عکاسی کے ساتھ ساتھ ایک چیز اور اس میں جلوہ گر ہوتی ہے جس کو ہم تخلیق کنندہ کی خواہشات اور تمناؤں کا عکاس کہہ سکتے ہیں یہی وہ عنصر ہے جو ادبیات کو ماحول کا عکاس اور آئنہ دار بنانے کے ساتھ ساتھ اس کو ماورائے ماحول بھی کر دیتا ہے۔ ڈاکٹر صفا جب کسی عہد کے مذہبی، سیاسی اور سماجی حالات کا مطالعہ کرتے ہیں تو اسی کے پس منظر میں اس دور کے ادبیات کو بھی جانچنے اور پرکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر انھوں نے چوتھی اور نصف پانچویں صدی ہجری کے ادبیات کا جائزہ لینے سے پہلے اس دور کے ایران کی عام حالت، وہاں کے مذہبی افکار، مذہبی اختلافات، سیاسی مناقشات، سماجی اتھل پتھل کی تفصیل سے نشان دہی کرنے کے بعد جب اس دور کی شاعری کا جائزہ لیا تو ان کو اِس نتیجہ پر پہنچنے میں مدد ملی جو اپنی

کے الفاظ میں یہ ہے۔

"از خصائص اشعار این عہد یکے آنست کہ وضع زندگی شعرار و اوضاع اجتماعی و احوال مختلف اجتماعات و دربارہا دربیانات نظامی دسیاسی در آن منعکس است و علت اساسی این امر ہمان واقع بینی وآشنائی شاعران با محیط مادی و خارجی و توجہ کمتر بعوالم خیالی و اوہام وخیالات است، این است کہ بیان لشکرکشی ہائے سلاطین و سخن از زندگی خصوصی شعرار و افراد و ورود در مسائل مختلف حیاتی بیشتر طرف توجہ قرار می گرفتہ است تا پیچیدن باوہام وخیالات باریک مگر در اشعارِ غنائی و غزلی"[1]

اس عہد کے اشعار کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان سے شعرار کی ذاتی زندگیاں اجتماعی روش درباروں اور معاشرہ کے مختلف حالات اور جنگی وسیاسی وقوعات منعکس ہوتے ہیں اس بات کا بنیادی سبب یہ ہے کہ اس دور کے شعرار نے عالمِ خیال اور اوہام کی طرف کمتر توجہ دی ہے اور اپنی ساری توجہ اپنے مادی اور خارجی ماحول پر مرکوز رکھی ہے یہی وجہ ہے کہ بادشاہوں کی لشکرکشیوں، مخصوص افراد اور شاعروں کی زندگیوں، زندگی کے مختلف مسائل کے بیان کی طرف زیادہ توجہ دی ہے اور سوائے غنائی اور معتزلانہ اشعار کے (کسی بھی صنف میں) اوہام اور باریک خیالی میں نہیں الجھے ہیں۔

ڈاکٹر صفا کے مندرجہ بالا خیالات سے اول تو اختلاف کرنا ہی دشوار ہے اور اگر کدو کاوش کے بعد اختلاف کیا بھی جا سکتا ہے تو وہ صرف جزوی اختلاف ہوگا۔ عہد زیرِ بحث کے جتنے بھی شعرار کا کلام ہمارے دسترس میں ہے اگر ہم ان کا مطالعہ غائر اور عمیق نظروں سے کریں گے تو ہم بھی انہی نتائج پر پہنچیں گے جن کو ڈاکٹر صفا نے مندرجہ بالا اقتباس میں بہت ہی کم الفاظ میں جامعیت کے ساتھ ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے۔

اسی طرح سے انھوں نے چھٹی صدی ہجری کے ایران کا جائزہ لیتے ہوئے اُس

---

[1] ج ۱، ص ۳۶۵

زمانے کے انتشار، بے چینی، نراج، سیاسی اور سماجی نا استواری کا بطورِ خاص ذکر کیا ہے ان باتوں کا اثر پورے ماحول پر پڑا اور عام انسانوں سے لے کر دانشوروں تک ہر طبقہ کے افراد نے ان حالات کی سنگینی کو نہ صرف محسوس کیا بلکہ ان سے دل برداشتہ بھی رہے اور نجات کے خواہاں بھی۔ مختلف طبقات پر ان حالات کا ردِ عمل کس کس طرح اور کن کن شکلوں میں ظاہر ہوا ڈاکٹر صفا نے اس کا جائزہ تو اس لیے نہیں لیا کہ یہ بحث ان کے موضوع سے خارج تھی لیکن ان حالات کا اس زمانے کے شاعروں پر کیا ردِ عمل ہوا اور اس ردِ عمل کا اظہار انھوں نے کس کس طرح کیا یہ بحث ڈاکٹر صفا کے موضوع کے عین مطابق ہے اسی لیے انھوں نے شاعروں اور ادیبوں کے ردِ عمل کو خاص طور سے اپنا موضوع مطالعہ قرار دیا ہے اور اس سلسلے میں ایک طول وطویل بحث کرکے اس زمانے کے "وضع ادبی" کو اس دور کے آئنہ حالات میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلے میں ان کا یہ اقتباس خاص طور سے قابل مطالعہ ہے۔

"اثر بارز این اوضاع در شعر و ادب قرنِ ششم کاملاً آشکار است۔ کمتر شاعری ست کہ در این عہد از انتقاداتِ سختِ اجتماعی برکنار ماندہ و از اہل زمانہ شکایتہای جانگداز نکردہ و یا از آنان بزشتی نام نبردہ باشد۔ این شکایت ہا ہمہ انعکاسی از افکار عمومی است و در آنہا ہمہ خلق از امرا و وزرا و رجالِ سیاست و دین گرفتہ تا مردم عادی بباد انتقاد گرفتہ شدہ اند[1]"

چھٹی صدی ہجری کے شعر و ادب میں اس بیش قیمت روش کا اثر پوری طرح ظاہر ہوتا ہے۔ بہت ہی کم ایسے شاعر ہیں جو اپنے معاشرہ پر سخت ترین تنقید کرنے سے باز رہے ہوں اور انھوں نے اپنے زمانے کے افراد کی سخت ترین شکایتیں نہ کی ہوں یا ان کو برے الفاظ سے نہ یاد کیا ہو۔ شعرا کی یہ شکایتیں عوامی احساسات کی ترجمان ہیں ان شکایتوں میں امرا و وزرا، مردانِ سیاست و رہنمایانِ مذہب سے لے کر عام افراد تک پر تنقیدیں کی گئی ہیں۔

---

1 ج ۲ ص ۱۲۵

چھٹی صدی ہجری کی فارسی شاعری میں زمانے کی شکایت اور اپنے معاشرہ سے بے اطمینانی کے اظہار کا جو خاص انداز ملتا ہے اس کو اگر ڈاکٹر صفا کے پیش کردہ مذہبی، سیاسی اور سماجی مناقشات کی روشنی میں نہ دیکھا جائے تو ان کے وجود میں آنے کی اصل وجہ نہ صرف یہ کہ نگاہوں سے پوشیدہ رہے گی بلکہ ان کی ماہیت و کیفیت کی تفہیم بھی آج کے دور کے قاری کے لیے مشکل ہو جائے گی اور وہ یہ سمجھنے سے قاصر رہے گا کہ پوری قوم کی قوم کیوں ایک مخصوص قسم کی بولی بولنے لگی تھی لیکن جب اس کو ڈاکٹر صفا کے پیش کردہ حالات سے بھی آگاہی ہوگی تو آج کے قاری کو بھی اس بات کے سمجھنے میں کوئی دقت نہ پیش آئے گی کہ اس دور کے شعرا کے یہاں دنیا سے بیزاری اور احتجاج کی یہ لہر کیوں ملتی ہے۔

ڈاکٹر صفا کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ ادبیات کو اس دور کے مروجہ مذہبی خیالات سے جدا کر کے دیکھنے کے قائل نہیں ہیں بلکہ ہر دور کے ادبیات کے مطالعہ کے وقت وہ اس دور کے ان تمام مذاہب کا غائر نظروں سے مطالعہ کرتے ہیں جو کسی نہ کسی طرح ادبیات کو متاثر کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے ظہورِ اسلام کے بعد کے ادبیات پر بحث کرتے ہوئے زرتشتی، مزدکی اور مانوی مذاہب کے ان خیالات کو بھی اپنا موضوع بحث بنایا ہے جنھوں نے ظہورِ اسلام کے بعد کے ادب کو بھی نہ صرف متاثر کیا ہے بلکہ اس کو بھی اپنے قالب میں ڈھالنے کی سعی کی ہے۔ ڈاکٹر صفا نے ہر عہد کے مذہبی مناقشات کا خاص طور سے مطالعہ کرتے ہوئے اس بات کا پتہ لگانے کی کوشش کی ہے کہ ان مذہبی اختلافات نے ادب کو کس کس طرح اور کن کن شکلوں میں متاثر کرتے ہوئے اس کو اپنا عکاس و ترجمان بھی بنایا ہے۔ جس زمانے میں مذہبی مناقشات بڑھ جاتے ہیں اور پورا معاشرہ مختلف مذہبی گروہوں میں بٹ جاتا ہے اس دور کا ادب اسی کیفیت کی غمازی کرتا ہے۔ شعرا اور ادبا بھی ان اختلافات سے اسی طرح متاثر ہوتے ہیں جس طرح اس معاشرہ کا کوئی عام فرد متاثر ہوتا ہے۔ اس طرح کے مذہبی اختلافات سے اگرچہ معاشرہ انتشار و پراگندگی کا شکار ہوتا ہے مگر اس شر کے پہلو سے ایک خیر بھی

عالمِ وجود میں آتا ہے جس کو ہم ادب کی گوناگونی کا نام دیتے ہیں ڈاکٹر صفا نے تو اس گوناگونی کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا ہے لیکن اس حقیقت کی ضرور نشان دہی کر گئے ہیں کہ ایسے انتشار اور پراگندگی کے دور میں ہر ادیب اور شاعر اپنے زمانے کے مذہبی اختلافات سے نہ صرف متاثر ہوتا ہے بلکہ کسی ایک مذہبی طبقے کی ترجمانی بھی کرتا ہے۔ ادیب کی محرومی یہ ہے کہ وہ جس مذہبی طبقے کے افکار و خیالات کو اپنے ادب کے سانچے میں ڈھال کر اس کو بقائے دوام کا لباس پہناتا ہے وہی مذہبی طبقہ اس کو "بے دین" بھی سمجھتا ہے۔ بہر حال یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا، ڈاکٹر صفا کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ کسی دور کے ادب کو اس دور کے مذہبی معتقدات اور اختلافات سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ ان کے اصل الفاظ یہ ہیں؛

" دامنۂ اختلاف مذہبی دراین دورہ چنان وسعت گرفتہ بود کہ از عوام و مردم غوغا بخواص کشیدہ، و نہ تنہا، چنانکہ دیدہ ایم، علمار در ردیک دیگر بتالیف کتاب ہا مبادرت می جستند بلکہ شاعرانِ زمان ہم دریں گونہ تعصبات شرکت می کردہ و اظہار عقائد مذہبی خود یا ہجو و انتقاد مخالفان مذہبی مبادرت می نمودہ اند و حتی گاہ تہمت ہائے مذہبی را وسیلۂ انتقام قرار می دادہ اند و حالانکہ غالب آنان بہ بی دینی و خلاعت مشہور بودہ اند"[1]

اس دور میں مذہبی اختلافات کے دامن نے اتنی وسعت اختیار کر لی تھی کہ عام لوگوں کے علاوہ خواص میں بھی جنگ ہونے لگی تھی۔ جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے صرف علمار ہی ایک دوسرے کے رد اور بطلان میں کتابیں لکھنے میں مصروف نہ تھے بلکہ شعرار بھی اس طرح کے تعصبات میں شریک ہو کر یا تو اپنے مذہبی عقائد کا اظہار کرتے یا اپنے مذہبی مخالفوں کی ہجو اور تنقید کرتے۔ حالانکہ ان شعرار کی ایک بڑی تعداد فاسق و بے دین کے نام سے مشہور تھی پھر بھی یہ (شعرار) مذہبی تہمتوں کو انتقام کا ایک وسیلہ قرار دیتے۔

---

[1] ج ۲ ص ۱۴۰

مندرجہ بالا اقتباس میں ڈاکٹر صفا نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان پر کسی مزید بحث کی ضرورت یوں محسوس نہیں ہوتی کہ ایران کی تاریخ کے صفحات ان کے خیالات کی توثیق و تصدیق کرتے ہیں۔

پانچویں صدی ہجری کے وسط سے لے کر چھٹی صدی ہجری کے خاتمے تک کا فارسی شاعری کا جو دور رہا ہے اس کی غالب خصوصیت دنیا اور اہلِ دنیا سے بے زاری اور زندگی کی ناپائیداری کا شدید احساس ہے۔ اس احساس کے پیدا ہونے کی وجہ ڈاکٹر صفا کے نزدیک یہ ہے کہ اس زمانے میں ایران پر "غلاموں" اور "وحشی زرد پوست" قبیلوں کا تسلط بڑھتا جا رہا تھا جس کی وجہ سے ایرانیوں کے دلوں میں اپنے ماحول سے ایک لاتعلقی کا جذبہ پیدا ہونے لگا تھا اس پر مستزاد یہ کہ اس دور میں جبر و ظلم، قتل و غارت گری کا بھی بازار گرم ہو گیا جس کا شکار بیشتر ایرانی ہی ہوتے۔ ان حالات کا فائدہ اٹھا کر عوام الناس اور علمار ظاہر معاشرہ کے پیش منظر پر قابض ہو گئے۔ ان لوگوں کے پیش منظر پر آجانے کی وجہ سے وہ افراد جن کو اپنے حسب و نسب پر فخر و غرور تھا اور جو اپنے آپ کو دنیا کی برترین نسل میں محسوب کرتے تھے بجھے بجھے سے رہنے لگے۔ اس طرح جب دھیرے دھیرے ان کے ہاتھوں سے دنیا نکلنے لگی تو انھوں نے دنیا اور اہلِ دنیا سے بے رغبتی کا اظہار اپنے اشعار کے ذریعہ کرنا شروع کر دیا ڈاکٹر صفا کا خیال یہ ہے کہ اِس سے پہلے کے دور میں شعرار اپنے معاشرہ سے کبھی بھی بد دل اور بے تعلق نہیں ہوئے تھے لیکن اس عہد کے حالات نے ان کو اس قدر پیچھے ڈھکیل دیا تھا کہ وہ زمانے کا ساتھ دینے کے قابل نہیں رہ گئے تھے اِسی احساسِ بے چارگی کے عالم میں اس دور کے شعرار مکر و فریبِ زمانہ کے شاکی ہوئے اور اسی شکایت کی بنار پر دنیا اور اس سے متعلق ہر چیز سے ان کو اس طرح نفرت ہو گئی کہ انھوں نے اعلانیہ اس سے انقطاع کر لیا۔ اس صورتِ حال کا نقشہ ڈاکٹر صفا نے ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔

" ازمسائل قابل توجہ در شعر فارسی ایں دورہ یکے بدبینی شدید	اس دور کی فارسی شاعری کی قابلِ توجہ خصوصیات میں سے ایک خصوصیت شعرا

شاعران در شعر است۔ تا بسامانی وضع اجتماع دریں عہد و مشکلاتی کہ برای خلائق از جہاتِ مختلف وجود داشت، بنحوی کہ دیدہ ایم، بناخوشنودی عقلاء، از اوضاع زمان و در نتیجہ بدبینیٔ آنان نسبت بہ دنیا و مافیہا و انقطاع از جہان و جہانیان انجامید۔ در شعر دورۂ قبل فکر انقطاعِ شاعر از عالم و عالمیان و بدبینیٔ او بجامعہ و محیط تقریباً نایاب بودہ است اما در دورۂ مورد مطالعۂ ما این افکار بہ شدت و در اشعار اکثر شاعران دیدہ می شود وکمتر کسی است کہ از تسلط غلامان و قبائل وحشی زردپوست و از غلبۂ عوام و متظاہرین بدین و از رواجِ فساد و دروغ و تزویر و قتل و غارت و ظلم و عدوان و امثال ایں امور شکایت نکند۔ اندک اندک دنبال ایں شکایت بعالم و ہرچہ در وست کشید[1]۔

کی زبردست قنوطیت ہے جو اس عہد کے معاشرہ کی ان تکلیفوں کا نتیجہ ہے جو مختلف سمتوں سے لوگوں پر ٹوٹ پڑی تھیں جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے، معاشرہ کی روش اور حالات سے بیزاری اور اس کے نتیجہ میں قنوطیت کا پیدا ہونا، اس زمانے کے خواص (عقلاء) کا دنیا اور اہلِ دنیا سے کٹ جانے کا سبب ہوا اس سے قبل کے دور میں شعراء کا دنیا اور اہلِ دنیا سے کٹ جانے کا خیال اور اپنے سماج اور ماحول سے بے اطمینانی و ناامیدی تقریباً مفقود تھی لیکن اس دور میں جس کا ہم مطالعہ کر رہے ہیں بہت سے شعراء کے یہاں یہ افکار شدت کے ساتھ دیکھے جا سکتے ہیں اور شاید ہی کوئی ایسا شاعر ہو جس نے زرد چمڑی والے غیر متمدن غلام قبائل کے تسلط، دین پر اہلِ ظاہر کے غالب آنے اور فساد، جھوٹ، مکر، قتل، غارت گری، ظلم و ستم اور اسی طرح کی باتوں کی شکایت نہ کی ہو۔ دھیرے دھیرے یہ شکایت دنیا اور دنیا میں موجود ہر چیز کی شکایت میں تبدیل ہو گئی۔

مندرجہ بالا اقتباس میں ڈاکٹر صفا نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے اگر ان کی روشنی میں پانچویں اور چھٹی صدی ہجری کی فارسی شاعری کا مطالعہ کیا جائے تو

لہ ج ۲ ص ۳۶۶

اس دور کے شعرار کے کلام کی تفہیم ہمارے لیے نہ صرف آسان بلکہ بامعنی بھی ہو جاتی ہے اگر ان خیالات سے صرف نظر کر لیا جائے تو پھر ہمارے لیے یہ سمجھنا مشکل ہو جائے گا کہ اس دور کی فارسی شاعری میں دنیا اور اہلِ دنیا سے اتنی نفرت کیوں ملتی ہے؟ اس دور کے شعرار مکر، فریب، دغل، فساد کا ذکر اس شدومد کے ساتھ کیوں کرتے ہیں؟ قتل، غارت، جبر اور استبداد کا ذکر ان کے یہاں بار بار کیوں آتا ہے؟ ان تمام سوالوں کا جواب فارسی ادب کے قاری کو اسی وقت مل سکتا ہے جب وہ اس دور کے شعرار کے کلام کو اس پس منظر میں پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش کرے گا جس کو ڈاکٹر صفا نے تاریخ ادبیات در ایران کے صفحات میں پیش کر دیا ہے۔ اس دور کے شعر و ادب کو اگر اس پسِ منظر سے الگ کر کے دیکھنے کی کوشش کی جائے گی تو بہت سی چیزیں آج کے قاری کے لیے ناقابلِ تفہیم ہوں گی۔

عہد زیر بحث کے فارسی ادبیات کو خانقاہ کی شکل میں ایک نئی پناہ گاہ ملی۔ اس پناہ گاہ کی وجہ سے ادبیات کو دربار کی گھٹی ہوئی، سمٹی سمٹائی، بندھی ٹکی اور محدود فضا سے نکل کر ایک ایسی فضا میں آنے کا موقع ملا جس کی وسعت لامتناہی تھی اور تجربات گوناگوں۔ جس نے شعرار کی فکر و احساس کو نئی قوت بخشی۔ اس لامتناہی وسعت اور گوناگوں تجربات کی وجہ سے اس دور کے بیشتر شعرار خانقاہ کی پناہ گاہ میں اگر اپنی قوتِ متخیلہ سے نئے نئے تجربات کرتے اور اس طرح فارسی شاعری کے دامن کو وسیع تر کرتے رہتے۔ اس زمانے میں جبکہ خانقاہ سے باہر کی دنیا جنگ و جدل، ظلم و ستم اور دار و گیر کا شکار ہوتی اور وہاں کا بسنے والا ہر متنفس اپنے وجود سے نالاں ہوتا — خانقاہ کی دنیا میں ایک دائمی اور ابدی سکون طاری رہتا۔ صرف یہاں کے بسنے والوں کے خیالات میں البتہ تجربات کی گوناگونی کی وجہ سے ایک نوع کا ہیجان برپا رہتا جو شعر کے قالب میں ڈھلا کرتا۔ ڈاکٹر صفا فارسی شاعری میں خانقاہ کے اس رول سے بہت متاثر ہیں اور انھوں نے اس حقیقت کی طرف جو اشارہ کیا ہے وہ انھی کے الفاظ میں سننے کے قابل ہے۔

"راہ جستن شعر در خانقاہ ہا از مہم ترین مسائلی است کہ باید در شعر

شاعری کا خانقاہوں میں داخل ہونا اس دور کا اہم ترین واقعہ ہے اس دور کی

این دوره بآن توجه داشت زیرا این امر موجب شد که شعر فارسی از محیط محدود دربارہا بیرون آید و در وسعت موضوعات آن آفرائش بسیار حاصل شود و سادگیِ بیان و قوت احساسات و عواطف در آن صد چندان گردد و ازین پس حتیٰ در دشوار ترین ایام تاریخیٔ ایران یکے از پشتی بانان بزرگ شعر در این سرزمین ہمیں خانقاہ ہا و خانقاہیان بوده اند و افکار و اندیشہ ہای لطیفِ عارفان صیقل اشعارِ پارسی گردید و بر جلا و رونق و شکوه آن افزود[1]

شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے اس نکتہ پر بھی توجہ مرکوز رکھنی چاہیے کیونکہ اسی واقعہ کی بنا پر فارسی شاعری دربار کی محدود فضا سے نکل کر باہر آتی ہے اور اس کے موضوعات میں ایک گونہ وسعت پیدا ہوتی ہے اور سادگیِ بیان، قوت احساسات اور اعلیٰ انسانی جذبات کی ترجمانی صد گونہ بڑھ جاتی ہے۔ مزید برآں تاریخِ ایران کے دشوار ترین زمانے میں خانقاہیں اور خانقاہ نشین حضرات شاعری کے زبردست سرپرست رہے ہیں (ان کی سرپرستی کی بنا پر) لطیف عارفانہ افکار و خیالات نے فارسی شاعری پر جلا کی اور اس عظمت و رونق کو مزید بڑھا دیا۔

اس اقتباس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ایران میں متصوفانہ شاعری کن حالات میں عالمِ وجود میں آئی اور اس نے فارسی شاعری کے دامن کو کس کس طرح اور کن کن شکلوں میں وسعت بخشی۔ اس دور کے مذہبی اختلافات کے باوجود چونکہ خانقاہیں اس افتراق سے عاری تھیں اسی لیے متصوفانہ شاعری جو خالص خانقاہوں کی پیداوار ہے مذہبی شاعری ہوتے ہوئے بھی مذہبی عصبیت سے پاک و مبرّا اور انسانیت دوستی کی حامل ہے۔ اگر یہ خانقاہیں بھی اسی طرح سے مذہبی اختلافات کا شکار ہوتیں جس طرح اس دور کا پورا معاشرہ شکار تھا تو پھر فارسی کی متصوفانہ شاعری یا تو عالمِ وجود میں ہی نہ آتی اور اگر کسی نوع کی مذہبی شاعری کی ابتدار خانقاہوں سے ہوتی بھی تو وہ انسانیت دوستی، بھائی چارہ

---

[1] ج ۲ ص ۳۴۹

اور صلح و آشتی کا وہ پیغام لے کر نہ پیدا ہوتی جو فارسی کی متصوفانہ شاعری کا خاصہ ہے۔

اسی عہد کی شاعری پر بحث کرتے ہوئے ڈاکٹر صفا نے ایک اور بات کی بھی نشاندہی کی ہے جو اپنی اہمیت کے لحاظ سے اس قابل ہے کہ ہم بھی اس کی طرف مختصر سا اشارہ کرتے چلیں۔ عہد زیر بحث کی شاعری کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے اس بات کی نشاندہی تو کردی ہے کہ اس دور کی فارسی شاعری میں دنیا اور اہلِ دنیا سے بے تعلقی، زندگی کی ناپائیداری اور زمانے کا شکوہ کیوں ملتا ہے۔ اسی کے ساتھ اس بات کی بھی نشان دہی ہوگئی ہے کہ ان حالات میں خانقاہوں نے شعرا اور شاعری کی پشت پناہی کی اور ان کو ارتقا کی راہ پر گامزن رکھا لیکن اس عہد کی شاعری کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس دور کی فارسی شاعری نے اپنے زمانے کے متداول علوم و فنون کا بھی اثر قبول کیا اور اِسی اثر کے تحت فارسی شاعری میں مزید گوناگونی پیدا ہوئی۔ اس مزید گوناگونی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر صفا نے لکھا ہے۔

" از میانِ افکار و اطلاعات مختلف ایں دورہ تنہا اندیشہ ہای عرفانی نیست کہ در شعر راہ جست، حکمت و علوم مختلف اندیشہ ہای دینی و افکار و اطلاعات مذہبی ہم در شعر اثر بین و آشکار داشت۔ شاعران زمانِ خاصہ اواخر ایں دورہ کوشش بسیار داشتند در آنکہ اطلاعات مختلف خود را در شعر اظہار کنند و از دانشہای کہ در مدرسہ و نزد استاد آموختہ بودند در بیان مضامین شاعرانہ استفادہ بردند

اس دور میں صرف متصوفانہ افکار و خیالات ہی نے شاعری میں جگہ نہیں پائی بلکہ فلسفہ، مختلف علوم اور مذہبی افکار و خیالات نے بھی اس دور کی شاعری کو جس طرح متاثر کیا ہے۔ وہ بین اور آشکار ہے۔ اس دور کے شعرا بالخصوص اس دور کے آخری زمانے کے شعرا نے اس بات کی خاص طور سے کوشش کی ہے کہ وہ مختلف علوم و فنون کے بارے میں جو معلومات رکھتے ہیں ان کو اپنے اشعار میں پیش کریں اور وہ علوم و فنون جو انھوں نے مدرسوں میں اپنے استادوں سے

"و اگر کسے را می یافتند کہ ازیں کار برکنار ماندہ بود او را بی مایہ و کم اطلاع می شمردند و بر سخن او عیب می گرفتند [1] "

پڑھے ہیں، شاعرانہ مضامین کو بیان کرتے وقت ان سے بھی استفادہ کریں۔ اگر کوئی شاعر اس روش پر گامزن نہ ہوتا تو اس کو حقیر اور جاہل گردانتے اور اس کے اشعار پر تنقید کرتے۔

ان چند اقتباسات کے مطالعے سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر صفا نے اپنی تاریخ ادبیات ایران کو مرتب کرتے وقت ادب کے محرکات کو تلاش کرنے اور اس کو اس کے صحیح منظر میں دیکھنے کے لیے کتنی کدوکاوش کی ہے۔ اب ہم آخر میں ان کی تاریخ نویسی کا ایک اور پہلو سے جائزہ لینا چاہتے ہیں اور یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ انھوں نے اپنے عہد کے نمائندہ ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات کا تجزیہ کرتے وقت ان تمام عوامل کو ابھارنے اور ادبیات میں ان کی کارفرمائی کو دکھانے کی کس حد تک کوشش کی ہے جن کا جائزہ لیے بغیر وہ کسی بھی ادب کے جائزہ کو مکمل نہیں خیال فرماتے۔ اس سلسلے میں طوالت کے خوف سے ہم مثال کے طور پر صرف دو ایک ہی شعرا کا انتخاب کر سکیں گے۔ ان ہی چند مثالوں سے اندازہ ہو سکے گا کہ ڈاکٹر صفا اس پہلو سے تاریخِ ادبیات نویسی میں کس حد تک کامیاب ہو سکے ہیں۔

اس سلسلے میں ہم سب سے پہلے ان کے ان افکار کا جائزہ لیتے ہیں جو انھوں نے فردوسی کے سلسلے میں ظاہر فرمائے ہیں۔ مجموعی طور سے انھوں نے اپنی کتاب کے جو نسٹھ صفحات فردوسی کے مطالعہ کے لیے وقف کیے ہیں جن میں سے تیئیس صفحات پر فردوسی کے کلام کا انتخاب ہے اور اکتالیس صفحات میں فردوسی کی زندگی اور اس کے کلام کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ مذکورہ اکتالیس صفحات میں ڈاکٹر صفا نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے اس کا ایک مختصر سا خلاصہ پیش کرنے کے بعد ہم اپنے معروضات پیش کریں گے۔

ڈاکٹر صفا نے اپنے اس مطالعہ کی ابتدا فردوسی کے شرحِ حال سے کی ہے

---

[1] ج ۲ ص ۳۶۹

اس سلسلے میں انھوں نے بہت ہی تدقیق و کاوش سے مختلف ذرائع سے فردوسی کے حالاتِ زندگی بہم پہنچائے ہیں اور اس کی تاریخ ولادت و وفات کے سلسلے میں بھی جس حد تک ممکن تھا تحقیق کرکے اپنے نتائج سے قارئین کو آگاہ کرایا ہے اسی سلسلۂ سخن میں انھوں نے فردوسی کے خاندان کے بارے میں بھی معلومات بہم پہنچائی ہیں۔

فردوسی کی زندگی اور خاندان سے بحث کرنے کے بعد انھوں نے اس عقدہ کی گرہ کشائی کی کوشش کی ہے کہ فردوسی نے رزمیہ داستانوں کو کب سے منظوم کرنا شروع کیا اس سلسلہ میں انھوں نے داخلی اور خارجی دونوں طرح کے شواہد پیش کرکے اپنی بات کو عالمانہ اور محققانہ بات کا درجہ دے دیا ہے اس مرحلہ کو طے کرنے کے بعد ڈاکٹر صفا نے اس بات سے بحث کی ہے کہ فردوسی نے شاہنامہ کو نظم کرنے کی ابتدا کس زمانے سے کی۔ یہاں بھی انھوں نے داخلی اور خارجی دونوں طرح کے شواہد سے کام لیتے ہوئے انھوں نے ایک نتیجہ پر پہنچنے کی سعی کی ہے۔ ان تمام باتوں پر تحقیقی نظر ڈالنے کے بعد ڈاکٹر صفا نے اس سوال کو حل کرنے کی کوشش کی ہے کہ فردوسی شاہ نامہ کو نظم کرنے سے کس سنہ میں فارغ ہوا اور اس شاہ کار نظم کو اس نے محمود غزنوی کے نام کب اور کیوں اور کیسے معنون کیا؟ ڈاکٹر صفا کا خیال ہے فردوسی نے ۳۸۴ھ میں شاہ نامہ کو نظم کرنے کا کام ختم کرلیا تھا لیکن وہ شاہ نامہ متداول شاہ نامہ کے مقابلہ میں بہت مختصر تھا۔ فردوسی برابر اس میں اضافے کے لیے کوشاں تھا۔ اسی عالم میں اس کے شاہ نامے کی شہرت دُور دُور تک پہنچی اور اس کی شہرت کا غلغلہ محمود کے دربار میں بھی سنا گیا۔ اس کے بعد کی داستان ڈاکٹر صفا کے الفاظ میں یہ ہے۔

"فردوسی علی الظاہر بوسیلۂ نصر بن ناصر الدین سبکتگین برادر محمود (متوفی ۴۱۲ھ) یا بوسیلۂ ابوالعباس فضل بن احمد بایں پادشاہ آشنائی یافت (حدود سال ۳۹۴ یا ۳۹۵ھ) و بر آن شد کہ یک بار دیگر در شاہ نامہ نظر کند

بظاہر فردوسی نے سلطان محمود کے بھائی نصر بن ناصر الدین سبکتگین (متوفی ۴۱۲ھ) یا ابوالعباس فضل بن احمد کے ذریعہ اس بادشاہ کے دربار میں رسائی حاصل کی (تقریباً ۳۹۴ھ یا ۳۹۵ھ) اور اس بات پر آمادہ ہوا کہ ایک بار پھر شاہ نامہ پر

و در موارد لازم مدح محمود و بیان آثار او را بیفزاید و اثر جاوید خود را بشاہ غزنین تقدیم کند تا بدیں وسیلہ ہم از فقر و تہی دستی رہائی یابد و ہم شاہ نامۂ خود را از دستبرد حوادث مصون نگاہ دارد۔ ایں کارشش ہفت سال بطول انجامید و چنانکہ شاعر در پایان شاہ نامہ آوردہ است در سال چہارم صد ہجری انجام گرفت

زہجرت بشد پنج ہشتاد بار
کہ گفتم من ایں نامۂ شاہوار

لیکن چنانکہ دیدہ ایم چوں در آغاز داستانِ اشکانیان سخن از حادثۂ بخشیدن خراج یک سالہ مردم بلست بحادثۂ قحطِ خراسان (۴۰۱ تا اوایل ۴۰۲)، مدح و ستائش محمود نیز بہ آن ہمراہ است، معلوم می شود کہ با سال ۴۰۰ آخرین سال تجدید نظر در شاہ نامہ نہ بود و یا ایں سال بہ تقریب ذکر شدہ و مراد از آں حوالی سال ۴۰۱ است بہر حال فردوسی ظاہراً پس از سال ۴۰۱ - ۴۰۲ شاہ نامہ را بدربار محمود تقدیم کرد

نظرثانی کرے اور مناسب و برمحل مقامات پر محمود کی ستائش اور اس کے کارناموں کے بیان کا اضافہ کرکے اپنے شاہ کار کو بادشاہ غزنی کی خدمت میں پیش کرے تاکہ اس طرح وہ تنگ دستی اور فقر و فاقہ کی زندگی سے بھی نجات پائے اور اس کا شاہ کار دستبردِ زمانہ کی نذر ہونے سے بھی بچا رہے۔ یہ کام چھ سات سال کے عرصہ میں پورا اور جیسا کہ شاعر نے شاہ نامہ کے آخر میں لکھا ہے: ۴۰۰ھ میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔

زہجرت بشد پنج ہشتاد بار
کہ گفتم من ایں نامۂ شاہوار

لیکن جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے، اشکانیوں کی داستان کے شروع میں ربادشاہ کا ایک سال کا خراج معاف کر دینے کا ذکر ہے جس کا تعلق خراسان کے اس قحط سے ہے جو ۴۰۱ھ سے لے کر ۴۰۲ھ کے اوائل تک کے زمانے میں پڑا تھا، اور اسی ضمن میں محمود کی تعریف و توصیف بھی کی گئی ہے۔ (اس لیے محسوس ہوتا ہے کہ ۴۰۰ھ میں شاہ نامہ پر آخری بار نظرثانی نہیں کی گئی اور ۴۰۰ھ سے مراد لگ بھگ ۴۰۱ھ ہے۔ بہرحال ظاہری قرائن بتلاتے ہیں کہ فردوسی نے ۴۰۱ھ - ۴۰۲ھ کے بعد شاہ نامہ کو محمود کی خدمت میں پیش کیا اس وقت

"و دریں وقت حامی او فضل بن احمد اسفرائینی معزول و مطرود شدہ بود و طرفداری در دربار محمود غزنوی نداشت و شاہ نامہ بنظر قبول نگریستہ نشد[1]"

اس کا ہمدرد فضل بن احمد اسفرائینی معزول ہو کر راندۂ درگاہ ہو چکا ہے اور محمود کے دربار میں کوئی بھی فردوسی کا حامی و مددگار نہ تھا (اس لئے) شاہ نامہ شرف قبولیت حاصل نہ کر سکا۔

مذکورہ بالا خیالات کے اظہار کے بعد ڈاکٹر صفا نے محمود غزنوی اور فردوسی کے اختلاف پر تفصیلی نظر ڈالی ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے کتاب کے چار صفحات میں جس پہلے نکتہ سے بحث کی ہے اس کے تمام کے تمام شواہد اس ہجو سے بہم پہنچائے گئے ہیں جو فردوسی سے منسوب ہے۔ ڈاکٹر صفا کے اس سارے بیان کو پڑھ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک فردوسی سے منسوب ہجو فردوسی ہی کی ہے۔ حالانکہ صاحب موصوف کا یہ خیال درست نہیں ہے۔ اگر ہم نظامی عروضی سمرقندی کی روایت کو درست مان لیں تب بھی یہ مانے بغیر چارہ نہیں ہے کہ نظامی کے زمانے میں اس ہجو کے صرف چھ اشعار باقی رہ گئے تھے۔ ہمارے خیال میں ایک ایسی نظم کے ذریعہ جس کی صحت مشکوک ہو کوئی حتمی حکم لگانا درست نہ ہوگا۔ بہر حال ڈاکٹر صفا کے نزدیک فردوسی اور محمود کے اختلاف کے یہ چار وجوہ تھے

"۱۔ اختلاف مذہبی میان فردوسی کہ مذہب تشیع، و محمود کہ بہ تسنن معتقد بود، و ہر دو در عقیدۂ خود را راسخ بودند"

۱۔ سلطان محمود اور فردوسی کا مذہبی اختلاف، فردوسی شیعہ مذہب اور محمود سنی المذہب تھا اور دونوں اپنے معتقدات میں کٹر بھی تھے۔

۲۔ این کہ فردوسی ابوالعباس فضل بن احمد را مدح گفتہ و اورا بشاہ نامہ ستودہ است و چو شاہ نامہ را علی التحقیق پس از عزل ابوالعباس

۲۔ فردوسی نے ابوالعباس فضل بن احمد کی مدح کی تھی اور شاہ نامہ میں اس کی تعریف و توصیف بھی لکھی تھی جب فضل بن احمد کے معزول ہونے کے بعد فردوسی نے

---

[1] ج اول ص ۴۷۶، ۴۷۷

محمود تقدیم کرد ناگزیر معاندان
درباری ابو العباس فضل بن احمد
مداح او را آزار کردند و بسعایت و
تخلیط پرداختند۔ موضوع تخلیطِ معاندان
و حاسدان از جای جای شاه نامه
بخوبی آشکار می شود ۔۔۔۔۔
"۳ ۔ اختلاف عقیدۂ محمود و فردوسی بر سرِ
مسائل نژدی و ملی ۔ فردوسی محققا ایرانی
میہن پرستی بوده و در شاه نامه نیز بحکم
شرایط حماسۂ ملی ناگزیر همواره
دشمنان ایران را مانند تازیان و ترکان
بدی یاد می نموده است و محققاً متنِ
شاه نامۂ ابو منصوری هم وی را بچنین
امری وا دار می کرد) و بالعکس از ایرانیان
همواره به نیکی سخن می گفت
و این امر ظاهراً مایہ کدورتِ
خاطر محمود، کہ گویا مانند
هر پادشاه اجنبی ایران و
ممالک اسلامی بیانِ افتخاراتِ
ملل خوش دل نبود، گردیده و
این مطلب هم از اشعار
فردوسی و هم از یک حکایت
تاریخ سیستان بخوبی مدلل
می گردد ۔۔۔۔
۱۔ خست ذاتی محمود کہ فردوسی

سلطان محمود کی خدمت میں شاہ نامہ
پیش کیا تو ان درباریوں نے جو فضل بن احمد
کے مخالفین تھے اس کے مادح (فردوسی) کو
تکلیفیں پہنچائیں اور اس کی بدگوئیاں
کیں۔ حاسدوں کی ان بدگوئیوں کا ذکر
شاہ نامہ میں جگہ جگہ پر موجود ہے ۔۔۔
۳۔ محمود اور فردوسی کا نسلی و ملی اختلاف،
فردوسی بلاشبہ ایک ایرانی وطن پرست
تھا اور اس نے شاہ نامہ میں قومی رزمیہ
کی مناسبت سے ہر جگہ پر ایران کے
دشمنوں مثلاً عربوں اور ترکوں کا ذکر اچھے
الفاظ میں نہیں کیا ہے (بلاشبہ ابو منصوری
کے شاہ نامے نے فردوسی کو اس راہ پر
گامزن کیا) اس کے برخلاف اس نے
ایرانیوں کا ذکر ہمیشہ بڑے اچھے الفاظ میں
کیا ہے۔ بظاہر یہی چیز سلطان محمود کی
کدورت کا سبب بنی (سلطان محمود بھی)
دوسرے ایران کے غیر ایرانی بادشاہوں
اور دیگر ممالک اسلامی کے شہنشاہوں
کی طرح ایرانیوں کے قابلِ فخر کارناموں
کے بیان پر خوش نہ تھا اس بات کی
تصدیق فردوسی کے اشعار اور تاریخِ
سیستان کی ایک حکایت سے بھی
ہوتی ہے ۔
۴۔ محمود کی ذاتی کنجوسی جن کا ذکر فردوسی نے

بآن اشارہ کردہ است اورا از دادن صلہ جزیلی کہ فردوسی توقع داشت مانع شد چنانکہ صلہ و انعامی کہ در برابر رنج سی سالۂ شاعر حقیر می نمود بفردوسی داد کہ بقول شاعر بہای فقاعی می ارزید[۱]۔"

کیا ہے اس بات میں آڑے آئی کہ وہ فردوسی کو اس کا دل خواہ صلہ دے چنانچہ اس نے فردوسی کو جو صلہ دیا وہ اس کی تیس سالہ کدو کاوش کے مقابلہ میں بہت حقیر تھا اتنا حقیر کہ بقولِ شاعر ایک شراب پلانے والے ہی کیلئے مناسب تھا

مذکورہ بالا چاروں وجوہ کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر صفا نے بہت سی مشہور روایتوں کو افسانہ پردازوں کی اختراع سمجھتے ہوئے ان کو درست تسلیم کرنے میں تامل کیا ہے۔ ان مباحث کو سمیٹنے کے بعد انھوں نے فردوسی کے آثار سے بحث کی ہے اور فردوسی سے منسوب مثنوی یوسف زلیخا کے بارے میں ڈاکٹر صفا بھی اس نتیجے پر پہنچے ہیں جس پر ہندوستان کے نامور محقق حافظ محمود خاں شیرانی مرحوم کافی عرصہ پہلے پہنچ چکے ہیں۔ ڈاکٹر صفا کے نزدیک بھی اس نظم کا فردوسی سے انتساب ایک ادبی جعل سازی ہے۔ فردوسی کے آثار سے بحث کرنے کے بعد انھوں نے شاہ نامہ کی اہمیت، اس کے ترجمے، اور اس پر جو تحقیقات ہوئی ہیں ان پر مختصر لیکن جامع انداز سے نظر ڈال کر شاہ نامہ کی خصوصیات کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ تاریخِ ادبیات ایران کی جلد اول کے اکتالیس صفحات میں ڈاکٹر صفا نے جو عالمانہ گفتگو فرمائی ہے اس کا ایک سرسری سا خاکہ ناظرین کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ اس میں تو کوئی شبہ نہیں ہے کہ ڈاکٹر صفا نے اپنے فردوسی کے مطالعہ میں جو بحث اور جس انداز کی بحث فرمائی ہے اس سے چند مقامات پر اختلاف کرنے کے باوجود ہم عالمانہ اور محققانہ بحث کہنے پر مجبور ہیں اور ان کی کدو کاوش کی داد نہ دینا بے انصافی کے مترادف سمجھتے ہیں لیکن اس موقع پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صفا نے اپنی تاریخ ادبیات کو مرتب کرتے وقت جن اصولوں کو اپنے سامنے رکھ کر اس کو مرتب کرنے کا ارادہ کیا ہے شعرا اور ادبا کا انفرادی مطالعہ کرتے وقت وہ اپنے

---

[۱] ج اول ص ۴۷۹ تا ۴۸۲

اس ارادے میں کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں؟

اس مطالعہ کے شروع ہی میں ذکر کیا جا چکا ہے کہ تاریخ ادبیات در ایران کو ڈاکٹر صفا نے ایک سوچے سمجھے خاکے کے مطابق مرتب کرنے کی کوشش کی ہے اس خاکے کی تفصیل خود انھوں نے اپنے مقدمہ میں بیان کردی ہے جس کے جستہ جستہ اقتباسات ہم نے بھی جگہ جگہ پیش کر دیے ہیں تاکہ ان کی اس تصنیف کا جائزہ لینے میں آسانی ہو۔ خود ان کے خیالات کی روشنی میں جب ہم ان کی ان تحریروں کا جائزہ لیتے ہیں جو انھوں نے اپنے عہد کے نمائندہ شعرا اور ادبا کے بارے میں پیش کی ہیں تو ہم کو محسوس ہوتا ہے کہ اپنے کام کو شروع کرتے وقت انھوں نے جو مطمح نظر سامنے رکھا تھا، شعرا اور ادبا کے انفرادی مطالعہ کے وقت وہ اس مطمح نظر کے پابند نہیں رہ جاتے اور اس کے اکثر تقاضوں کو یکسر فراموش کر دیتے ہیں۔ اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ انھوں نے فردوسی کے کلام کا جائزہ لینے سے پہلے جو ابواب ایران کے عام حالات، اجتماعی زندگی اور ادبی روش کے بارے میں لکھے ہیں وہ انتہائی محققانہ اور عالمانہ ہیں لیکن جب ہم فردوسی کے بارے میں ان کے خیالات کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم محسوس کیے بغیر نہیں رہتے کہ اس مقام پر ان کے یہاں کوئی انفرادیت نہیں ہے اور وہ بھی روشِ عام کے ایک راہی بن کر رہ گئے ہیں۔ فردوسی کا مطالعہ کرتے وقت وہ معاشرہ اور فرد کے ربط کو یکسر نظر انداز کر دیتے ہیں اور یہ معلوم کرنے کی مطلق کوئی کوشش نہیں کرتے کہ فردوسی نے شاہنامہ ہی کو کیوں نظم کیا، شاعری کی دوسری اصناف میں طبع آزمائی کیوں نہیں کی؟ فردوسی کے عہد کی جو سیاسی، اجتماعی اور مذہبی کشمکش و کشاکش تھی اس نے فردوسی کی شاعری کو کس حد تک اور کس طرح متاثر کیا؟ فردوسی کی شاعری اجتماعی لاشعور سے کس حد تک متاثر ہوئی اور اس کی کارفرمائی نے فردوسی کے اشعار کو کس رنگ و آہنگ میں ڈھالا۔ ڈاکٹر صفا کے اس مطالعہ میں فردوسی کی اس ذہنی ناآسودگی، بے چینی اور بے اطمینانی کا بھی کوئی ذکر یا عکس نہیں ملتا جس سے ہر تخلیقی فنکار دوچار ہوتا ہے اور جس کی وجہ سے وہ آنے والے زمانے کے لیے خوش آئند خواب دیکھتا اور دکھلاتا ہے جس میں بہتر زندگی اور ایک نئی دنیا کے عالم وجود میں آنے کی بشارت ہوتی ہے۔ بلاشک و شبہ

فردوسی بھی اپنے ماحول سے مطمئن نہیں تھا اور اس کی زندگی بھی گوناگوں مسائل اور نشیب و فراز سے دوچار ہوتی رہی تھی اس لیے یہ تو ممکن ہی نہیں ہے کہ اس ناآسودگی اور بے چینی کا عکس اس کی شاعری پر نہ پڑا ہو۔ اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ فردوسی نے اس ناآسودگی و بے چینی کے عالم میں خوش آئند خواب نہ دیکھے ہوں اور ان خوابوں کی تصویر کشی اپنے اشعار میں کسی نہ کسی شکل میں نہ کی ہو۔ ڈاکٹر صفا ان تمام مسائل سے صرف نظر کرتے ہوئے فردوسی کے حالاتِ زندگی کی تحقیق فرماتے ہیں۔ شاہنامہ کے زمانۂ تصنیف کی تعیین کرتے ہیں۔ محمود اور فردوسی کے اختلافات پر عالمانہ نظر ڈالتے ہیں آثار فردوسی کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے کھرے اور کھوٹے کو الگ الگ کر دیتے ہیں لیکن اس تاریخ ادبیات کو مرتب کرنے کا جو اصل مقصد ان کے سامنے تھا اس کے مطابق فردوسی کے کلام کا جائزہ لینے سے گریز کر جاتے ہیں۔

ممکن ہے یہ کہا جائے کہ فردوسی کے بارے میں فارسی اور دوسری زبانوں میں اس قدر تحقیقی اور تنقیدی مواد فراہم کیا جا چکا ہے کہ ڈاکٹر صفا کو اس سے زیادہ کچھ اور لکھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی دوسرے شعرا اور ادبا کے انفرادی مطالعہ کے وقت ڈاکٹر صفا نے ذکر شدہ مسائل کا خیال رکھتے ہوئے شاعروں اور ادیبوں کا انفرادی مطالعہ کیا ہوگا۔ اس خیال کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم اب ایک دوسرے شاعر کے بارے میں ڈاکٹر صفا کے خیالات کا جائزہ لیتے ہیں اور یہ دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اس شاعر کا مطالعہ کرتے وقت ڈاکٹر صفا کس حد تک اپنے بنائے ہوئے خاکے کے پابند رہ سکے ہیں۔

ڈاکٹر صفا نے چھٹی صدی ہجری کے جن مشہور شعرا کا انفرادی مطالعہ اپنی کتاب کی دوسری جلد میں کیا ہے ان میں مجیر بیلقانی بھی شامل ہے جو خاقانی کا شاگرد ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی بعض دوسری خصوصیات کی وجہ سے بھی کافی عرصہ تک نہ صرف مشہور رہا بلکہ اس کے معاصر اور بعد کے آنے والے شعرا اس کے اشعار پر اشعار بھی لکھتے رہے۔ شعرا کے علاوہ نثر نگار بھی اس کے اشعار کے طلسم کے اسیر تھے۔ مجیر کے قتل کے تقریباً چالیس سال بعد ہی فارسی کی جو مشہور و معروف کتاب راحۃ الصدور کے نام سے لکھی گئی ہے اس کا مصنف راوندی مجیر کے اشعار کا اس قدر گرویدہ ہے کہ وہ مجیر کے

اشعار کو نثر بنا کر اسی سے اپنی تحریروں کو مزین کرتا ہے۔ ایسے مشہور و معروف شاعر کا جو مطالعہ ڈاکٹر صفا نے پیش کیا ہے وہ کتاب کے آٹھ صفحات پر مشتمل ہے جن میں سے ڈھائی صفحات پر اس کے حالاتِ زندگی، ممدوحین کا ذکر، ممدوحین کے سلسلے میں تذکرہ نگاروں کی غلطیاں، ممدوحین سے مجیر کے تعلقات، معاصر شعراء سے اس کے اختلافات اور اس کے سنہ وفات کی تحقیق کرتے ہوئے انھوں نے اس کے کلام پر مجموعی حکم لگایا ہے۔

"دیوانِ مجیر قریب بہ پنج ہزار بیت و مشحونست بقایدِ عالی و غزلہای لطیف، و او را باید حقاً از شاعرانِ نیکو سخن و خوش قریحۂ زمان شمرد۔ در اشعار او اثری سبکِ خاقانی تا حدی مشہود ست منتہی اولاً مجیر سخن سادہ تر دارد و ثانیاً ہیچ گاہ نتوانستہ است۔ قدرت کم نظیر استاد خود را در ایجاد ترکیبات بدیع و مضامین و معانی دقیق نشان دہد و ثالثاً اثر این اقتفا در ہمۂ قصائد او آشکار نیست بلکہ مجیر را در پارہ یی از قصائد او در ہمان مسیر عادی و طریقۂ معتاد شعر و زبانِ فارسی در اواخر قرنِ ششم مشاہدہ می کنیم[1]"

مجیر کا دیوان تقریباً پانچ ہزار اشعار پر مشتمل اور اعلیٰ درجے کے قصائد، لطیف قسم کی غزلوں سے معمور ہے یقیناً اس کو اس دور کا ایک خوش گو شاعر شمار کرنا چاہئے اس کے اشعار میں خاقانی کے اشعار کا طرز بھی دکھائی دیتا ہے۔ حاصل کلام یہ کہ اول تو اس کے اشعار سادہ تر ہیں دوئم یہ کہ وہ کبھی اس بات پر قادر نہیں ہو سکا کہ اپنے استاد کی طرح نئی نئی تراکیب اختراع کرے یا دقیق معانی و مضامین پیش کرے۔ سوئم یہ کہ اس تقلید کا اثر اس کے تمام قصائد سے ظاہر نہیں ہوتا بلکہ اس کے قصائد کے بہت سے ٹکڑے ہم ایسے بھی دیکھتے ہیں جو چھٹی صدی ہجری کے اواخر کی فارسی شاعری کے مجموعی انداز اور رنگ کے حامل ہیں۔

مندرجہ بالا اقتباس میں ڈاکٹر صفا نے مجیر کے بارے میں اپنے جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے ان میں نہ تو کوئی ندرت ملتی ہے اور نہ ہی ان کی مدد سے اس کے

---

[1] ج ۲ ص ۷۲۳

محرکاتِ شعری پر کوئی روشنی ڈالی جاسکتی ہے۔ خود ڈاکٹر صفا نے پانچویں اور چھٹی صدی ہجری کے ایران پر نظر ڈالتے ہوئے اس بات کی نشاندہی کی ہے[1] کہ اگرچہ مذکورہ صدیوں میں ایران میں مضبوط حکومتیں قائم تھیں لیکن ان صدیوں کو بہرحال قتل وغارتگری کی ہی صدیاں کہا جائے گا۔ اسی قتل وغارتگری کی وجہ سے ایرانیوں کا اطمینان وسکون ختم ہوگیا تھا اور ان کی زندگیاں ناآسودگی اور بے چینی کا شکار ہوکر رہ گئی تھیں۔ ڈاکٹر صفا نے جن تاریخی مآخذ کی بنیاد پر یہ بات کہی ہے اس کے ماننے میں ہمیں کوئی تامل نہیں ہے لیکن اس ناآسودگی اور بے اطمینانی کی عام فضا نے مجیر کی شاعری کو کس طرح اور کس حد تک متاثر کیا، ڈاکٹر صفا اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیتے اور اس کو چھیڑے بغیر ہی اپنی بات کہتے چلے جاتے ہیں۔ معاشرہ کی جس بے اطمینانی اور ناآسودگی پر انھوں نے مبسوط اور سیر حاصل بحث کی ہے اس کے بہت ہی صاف اور واضح عکس ہم کو مجیر کے قصائد اور غزلیات میں مل جاتے ہیں[2] خاص طور سے اس کی غزلوں کو سامنے رکھ کر اس کے ماحول کے تمام مسائل کو بڑے اچھے انداز سے مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ لیکن ڈاکٹر صفا کے یہاں اس حقیقت کی طرف کوئی اشارہ نہیں ملتا۔ حالانکہ ان کی تاریخ نگاری کا تقاضا یہ تھا کہ وہ مجیر کے اشعار کو سامنے رکھ کر اپنے قاری کو یہ بتلانے کی کوشش کرتے کہ مجیر نے جو بات کہی ہے وہ کیوں کہی ہے؟ یہی ان کی تاریخ نگاری کا اصل مقصد تھا، لیکن شعرا اور ادبا کے انفرادی مطالعے کے وقت وہ اسی اصل مقصد کو بھول جاتے ہیں۔ اگر ڈاکٹر صفا اپنی اسی روش کو برقرار رکھتے جو انھوں نے وضعِ اجتماعی، وضعِ سیاسی اور وضعِ ادبی کے ناموں سے موسوم ابواب میں رکھی ہے تو ان کی تاریخ ادبیات ایران کا یہ حصہ بھی ان کی مخصوص انفرادیت کا حامل ہوجاتا۔ افسوس ہے کہ شعرا اور ادبا کا انفرادی مطالعہ کرتے وقت وہ اپنی اس روش کو برقرار نہیں رکھ پاتے۔ اسی لیے تاریخ ادبیات در ایران کے وہ حصے جو شعرا اور ادبا کے انفرادی مطالعوں پر مشتمل ہیں ڈاکٹر صفا کے مخصوص طرزِ تفکر سے محروم ہوجاتے ہیں۔

---

[1] ج ۲ ص ۱۰۰ [2] راقم الحروف کا مقالہ "مجیر بیلقانی کی غزلیں" مشمولہ "بازگشت"، ۱۹۷۶ء مکتبہ جامعہ نئی دہلی ملاحظہ ہو۔

یہ نقص اپنی تمام عالمانہ بحثوں اور محققانہ عقدہ کشائیوں کے باوجود اس کتاب کا اس کی قدر و قیمت کو کسی حد تک مجروح کر دیتا ہے۔

صرف انہی مثالوں سے اندازہ ہو جائے گا کہ ڈاکٹر صفا شعراء و ادباء کے انفرادی مطالعے اس طرح نہیں کر سکے ہیں جس طرح کے مطالعے کی ان کی تاریخ نگاری متقاضی تھی۔

اختتامیہ

ڈاکٹر صفا کے قلم سے اب تک جو تصانیف اور تراجم منظرِ عام پر آچکے ہیں اس کی فہرست اس کتاب کے پہلے باب میں دی جاچکی ہے افسوس ہے کہ ہم اپنی اس کتاب میں ان کی تمام تصانیف کا جائزہ نہیں لے سکے جو ہزاروں صفحات پر محیط ہیں۔ ہم نے اپنی آسانی کے لیے ان کی صرف دو کتابوں کو منتخب کیا ہے جن کی مجموعی ضخامت تین ہزار صفحات کے قریب ہوتی ہے اور انہی تین ہزار صفحات کے مواد کو بنیاد بنا کر ان کی محققانہ روش اور عالمانہ کارکردگی کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ اپنے دور کے ایک بہت بڑے محقق، فرہنگ و علوم کے ایک باصلاحیت پارکھ، ادبیات اور علوم و فنون کے مؤرخ ہونے کے ساتھ ساتھ شاعر اور افسانہ نگار بھی ہیں ان کی شاعری اور افسانہ نگاری کے نمونے ابھی تک مختلف رسائل و جرائد میں بکھرے پڑے ہیں اور ان کو مرتب کر کے شائع کرنے کی نوبت نہیں آسکی ہے اس لیے ان کے کاموں پر تو کوئی حکم نہیں لگایا جاسکتا مگر ان کے رشحاتِ قلم کے نمونوں میں سے جو کچھ اب تک شائع ہو کر منظرِ عام پر آچکا ہے اس کا ایک سرسری ہی سا جائزہ لینے کے بعد یہ ماننا پڑے گا کہ انھوں نے اپنے بزرگوں کی روایات کو نہ صرف باقی رکھا ہے بلکہ اپنی انتھک محنت، دیدہ ریزی، ذہانت و ذکاوت کی مدد سے ان روایات کو آگے بھی بڑھایا ہے اور اس میں قابلِ قدر اضافے بھی کیے ہیں ان کے معاصرین میں بھی بہت سے ایسے فضلاء موجود ہیں جو اپنی اپنی جگہ پر نہ صرف استادانہ مہارت کے

حامل ہیں بلکہ اپنے اپنے موضوعات کی آبرو بھی قرار دیے جا سکتے ہیں لیکن ڈاکٹر صفا کی انفرادیت یہ ہے کہ انھوں نے عہد باستان سے اپنا رشتہ منقطع نہیں کیا بلکہ موجودہ دور کے ادب اور علوم وفنون کی جڑیں عہد باستان کے سینے میں تلاش کرنے کی کامیاب کوششیں کی ہیں۔ ان کی اسی تلاش وجستجو کی وجہ سے زمانۂ تاریخ سے لے کر آج تک کے ایرانی علوم وفنون کا تسلسل، ان کی نشو ونما، ارتقا کے تمام مراحل اور اس کے نشیب و فراز سب ہی سامنے آجاتے ہیں۔

اس کتاب کے پہلے باب میں ذکر کیا جا چکا ہے کہ آج کے ایرانی شعراء کا وہ طبقہ جو سُنّت شکن (روایت شکن) کے نام سے موسوم ہے، جو تخلیقی ادب پیش کر رہا ہے اس کا بیشتر بلکہ تقریباً تمام تر حصہ ڈاکٹر صفا کے نزدیک تخلیقی ادب کہلانے کا مستحق نہیں ہے ایک دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ خود ڈاکٹر صفا نے اپنے بزرگوں کی روایات کو توڑتے ہوئے شروع شروع میں آزاد نظمیں لکھنی اور چھپوانی شروع کی تھیں تو ان کے دور کے معمر شعراء کا بھی یہی خیال تھا کہ ڈاکٹر صفا کے یہ رشحات قلم خواہ کچھ بھی ہوں تخلیقی ادب کے زمرہ میں شامل نہیں کیے جا سکتے۔ بزرگوں کے اس خیال کے باوجود ڈاکٹر صفا کو اپنے نظریۂ ادبیات پر اس قدر راسخ یقین تھا کہ وہ مذکورہ نوع کی شاعری سے دست بردار نہیں ہوئے اور مسلسل اپنے کاموں میں لگے رہے۔ ڈاکٹر صفا ہی کی روایت کو سامنے رکھتے ہوئے جب آج کے سنّت شکن شعراء نئے نئے تجربات کرنا چاہتے ہیں، اپنے طریقۂ اظہار میں تبدیلی لانا چاہتے ہیں، استعارات اور تشبیہات کے نئے نئے استعمال وضع کرنا چاہتے ہیں تو کسی زمانے میں اسی روایت پر عمل کرنے والے ڈاکٹر صفا بھی ان کی روش سے مطمئن نہیں ہو پاتے اور سنّت شکن شعراء کی تخلیقات کو ادبیات کے زمرہ سے خارج سمجھتے ہیں۔ اس صورتِ حال میں قصوروار نہ ڈاکٹر صفا ہیں نہ سنّت شکن شعراء، دونسلوں کی یہ آویزش وکشاکش ہمیشہ سے ہوتی آئی ہے اور جب تک نسلِ انسانی میں سوچنے اور سمجھنے کا جذبہ باقی رہے گا، یہ آویزش وکشمکش برقرار رہے گی۔ وہ شعراء جو آج سنّت شکن کہلاتے ہیں آنے والا زمانہ انہی کو سنّتی (روایت پرست) کہے گا اور وہ بھی اپنے بعد کے آنے والے شعراء کے نئے نئے خیالات کو اسی طرح مسترد کرنے کی کوشش کریں گے جس طرح ڈاکٹر صفا آج ان کے خیالات کو مسترد کر رہے ہیں۔

اس آویزش و کشاکش کے باوجود ڈاکٹر صفا نے ایرانی علوم و فنون کی جو بیش بہا خدمات انجام دی ہیں اور جس طرح اپنا رشتہ ماضی سے جوڑے رکھنے کے باوجود نئے طریقۂ تحقیق اور نئے نئے انداز نظر کو قبول کر کے قابل قدر تصانیف پیش کی ہیں، ان کا احترام وہ طبقہ بھی کرتا رہے گا جو سنتی کہلائے گا اور وہ طبقہ بھی ان کے احترام پر مجبور ہوگا جو سنت شکن کے نام سے موسوم ہوگا۔

ادبیات کی دنیا میں اعلیٰ اور دوامی اقدار کی حامل تصانیف ہی زندہ رہتی ہیں، جو تصانیف وقت اور زمانے کا ساتھ نہیں دے پاتیں وہ وقت اور زمانے کے گزرنے کے ساتھ ساتھ پردۂ خفا میں چلی جاتی ہیں جن کو کسی بھی محقق کی تحقیق دوبارہ زندگی نہیں بخش سکتی ڈاکٹر صفا کے کارناموں کی قدر و قیمت کی اصل تعیین تو آنے والا زمانہ ہی کرے گا سر دست ہم صرف اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ ان سے جزوی اختلافات کرنے کے باوجود فارسی ادبیات پر کوئی بھی قلم اٹھانے والا ان کی محنت، دیدہ ریزی، تفہیم مسائل اور ادبیات کو اس کے صحیح پس منظر میں دیکھنے کے انداز کو نہ صرف سراہے گا بلکہ ان کی تقلید کی بھی کوشش کرے گا۔ ڈاکٹر صفا کے بعد کی نسل کی یہ روش ہی ان کے کارناموں کو اجاگر کرنے کیلیے بہت کافی ہوگی۔ ڈاکٹر صفا اب جس مقام پر پہنچ چکے ہیں وہاں ان کو یہ حق حاصل ہو چکا ہے کہ وہ اپنے بعد آنے والی نسلوں کو اس شعر سے مخاطب کر سکیں:

حاصلِ عمر نثار رہ یاری کردم
شادم از زندگیٔ خویش کہ "کاری" کردم